علی جواد زیدی: شخص اور شاعر

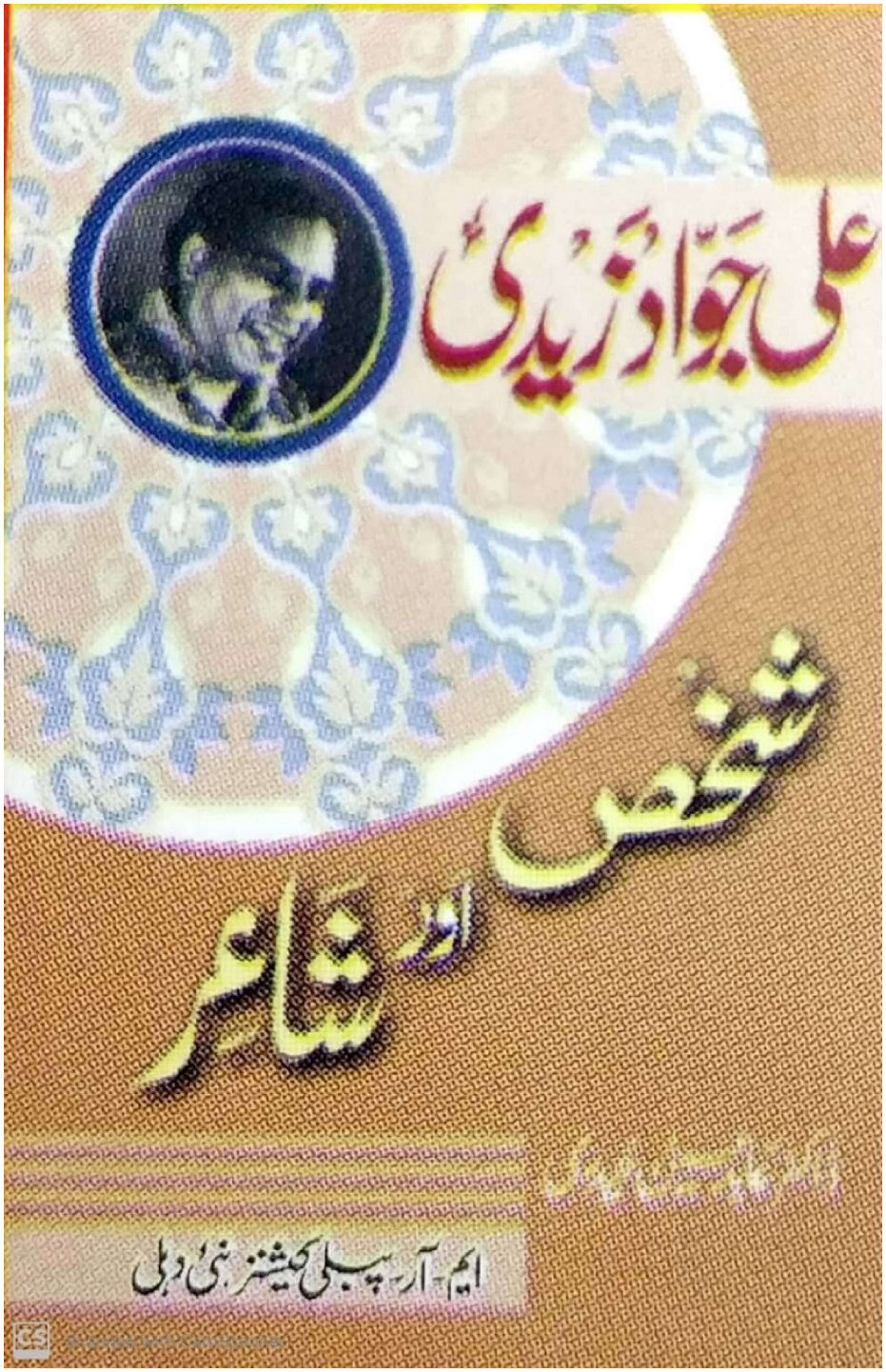

علی جواد زیدی

شخص اور شاعر

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ©

ALI JAWAD ZAIDI SHAKHS AUR SHAIR

By : Dr. Abid Husain Haidari
H.O.D. Urdu M.G.M. (P.G.) College, Sambhal
Moradabad (U.P.) 244302 INDIA

نام کتاب	:	علی جواد زیدی: شخص اور شاعر
نام مصنف	:	ڈاکٹر عابد حسین حیدری
سال اشاعت	:	۲۰۰۹ء
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
مطبع	:	نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرس دہلی
کمپوزنگ	:	اعظم علی پی سی کمپیوٹر گرافکس شنکر کالج مارکیٹ سنبھل (مرادآباد)
قیمت	:	
ناشر	:	**ڈاکٹر عابد حسین حیدری**

ایلیا منشن عباسی ٹولہ کوٹ غربی سنبھل مرادآباد یو. پی 244302

تقسیم کار : **ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز**

2695، گلی کالے خان، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

رابطہ: 09411097150
Email: drabidhusain@gmail.com

انتساب

اپنی شریک حیات

شہزادی بیگم

کے نام

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔زراعت ظرفی،سیفی بک ایجنسی ممبئی (۱۹۹۲ء)

(مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری پونے کے نصاب کے مطابق)

۲۔ادبیات کشمیر(مضامین علی جواد زیدی)نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ(۱۹۹۴ء)

۳۔علم سیاست،سیفی بک ایجنسی ممبئی (۱۹۹۵ء)

(مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری پونے کے نصاب کے مطابق)

۴۔علم نفسیات،سیفی بک ایجنسی ممبئی (۱۹۹۵ء)

(مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری پونے کے نصاب کے مطابق)

۵۔ارمغان محسنؔ (مراثی محسنؔ زیدپوری)انیس آفسیٹ پریس نئی دہلی ۱۹۹۹ء

۶۔اردو میں شخصی مرثیے کی روایت،ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی (۲۰۰۸ء)

زیر طبع

۱۔رثائیات تجزیات شخصیات (مجموعۂ مضامین)

ترتیب

☆ پیش گفتار ڈاکٹر شریف احمد قریشی ۹

☆ ابتدائیہ ڈاکٹر عابد حسین حیدری ۱۵

☆ علی جواد زیدیؔ: ایک تعارف ۱۹

☆ علی جواد زیدیؔ کی غزل گوئی ۲۹

☆ علی جواد زیدیؔ کی نظم گوئی ۴۵

☆ علی جواد زیدیؔ اور شخصی مرثیہ ۹۱

☆ علی جواد زیدیؔ اور دیگر اصناف سخن ۱۱۳

☆ اختتامیہ ۱۲۷

☆ علی جواد زیدیؔ سے ایک گفتگو ۱۳۷

☆ کتابیات ۱۴۳

پیش گفتار

غالبؔ کے مصرع 'نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا' کو عملی جامہ پہنانے والوں کا ہر دَور میں فقدان رہا ہے مگر اِس دُنیا میں ایسے لوگ بھی کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں جو شہرت و ناموری کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ڈاکٹر عابد حُسین حیدری، صدر شعبۂ اُردو، مہاتما گاندھی پوسٹ گریجویٹ کالج، سنبھل ضلع مرادآباد اُن نوجوان اور با صلاحیت اساتذہ میں سے ایک ہیں جو نام ونمود اور ستائش سے بے نیاز نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے درس و تدریس کے ساتھ علم و اَدب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کے تحقیقی، تنقیدی اور علمی مضامین و مقالات کے علاوہ دیگر علوم وفنون سے متعلّق نہایت کارآمد مضامین مُلک اور بیرونِ مُلک کے اخبارات و رسائل کی زینت بَن چکے ہیں۔ ادب کے علاوہ مختلف علوم وفنون پر بھی اُن کی کئی قابلِ قدر تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں زراعتِ ظرفی، ادبیاتِ کشمیر، علم سیاست، علمِ نفسیات اور ارمغانِ محسن نہایت اہم ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 'علی جواد زیدیؔ: شخص اور شاعر' کے علاوہ اُن کا ایک مجموعۂ مضامین 'رثائیات تجزیات شخصیات' بھی زیرِ طبع ہے۔ پی ایچ. ڈی کی ڈگری کے لئے پروفیسر انیس اشفاق عابدی، صدر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونی ورسٹی کی نگرانی میں قلم بَند کیا گیا اُن کا تحقیقی مقالہ 'اُردو میں شخصی مرثیہ کی رِوایت' 2008ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ جس کی اَدبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی کی گئی۔

موصوف نے اِس تحقیقی مقالہ میں شخصی مرثیہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی، اقسام اور ہیئت کے علاوہ ابتدا سے موجودہ دَور تک کے شخصی مرثیوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے اِس مقالہ میں شخصی مرثیہ کی اہمیت، افادیت اور معنویت پر بھی بھرپور رَوشنی ڈالی ہے۔

علی جواد زیدیؔ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اُن خوش نصیب اور نادرِ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں۔ جن کے لئے میرؔ نے کہا تھا کہ ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے اِنسان نِکلتے ہیں

زیدیؔ صاحب نے تقریباً سات دہائیوں تک عِلم واَدب کی خدمت کی ہے۔ اُن کی شخصیت کے متعدّد پہلو ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک پہلو ایک دوسرے سے تابناک نظر آتا ہے۔ اُن کی اَدبی وعِلمی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے اُنہیں 'پدم شری' کے خطاب سے بھی نَوازا۔ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اِداروں اور اکادمیوں نے اُنہیں متعدّد اعزازات و اِنعامات عطا کئے اور مختلف مکتبۂ فِکر کے ادباء، شعراء، علماء اور دانشوروں نے اُن کی خاطر خواہ پذیرائی بھی کی۔ اُن کے کارناموں اور عظمت کے اعتراف میں مختلف اخبارات ورسائل نے مضامین کے علاوہ خصوصی گوشے اور خاص نمبر بھی شائع کئے۔ اُن کے تمام کارناموں کا احاطہ کرنے اور پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے یونی ورسٹیوں میں تحقیقی مقالے بھی تحریر کئے گئے۔ ڈاکٹر عابد حُسین حیدری کی معرکتہ الآرا تصنیف 'علی جواد زیدیؔ: شخص اور شاعر' اِسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے مگر علی جواد زیدیؔ سے متعلّق دیگر

تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات سے بڑی حدتک منفرد۔

اِس مقالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عابدحُسین حیدری نے ہر ابواب کو بطریقِ احسن ترتیب دِیا ہے۔ اُنہوں نے معروضیت اور استدلالِ منطقی کا خاص خیال رکھتے ہوئے غلو اور مبالغہ سے اجتناب برتا ہے۔ اُنہوں نے اُن ذمّہ داریوں اور فرائض کو پوری طرح نباہا ہے جو ایک غیر جانب دار محقّق وناقد کے لئے ضروری ہیں۔

اِس مقالہ کے علاوہ میں نے ڈاکٹر عابدحُسین حیدری کی دیگر تنقیدی تحریروں کا بھی مطالعہ بھی کیا ہے اور اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی قدآور شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے اور نہ اپنے تعلّقات کی بِنا پر کسی کی بے جا تعریف کرتے ہیں۔ وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور موازنے کے مطابق فنکار کی شخصیت اور فَن پارے کی خصوصیات کا نہایت شایستگی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ علی جواد زیدیؔ سے ڈاکٹر عابد حُسین حیدری کے اچھّے مراسم تھے۔ زیدیؔ صاحب نے زینبیہ انسٹی ٹیوٹ آف اِسلامک اِسٹڈیز، ممبئی سے ایک دو ماہی رسالہ 'العلم' جاری کرایا تھا۔ جِس کے وہ مدیر اعزازی اور ڈاکٹر عابدحُسین حیدری اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ اِس کے باوجود اُنہوں نے اپنے اِس مقالہ میں زیدیؔ صاحب کی شخصیت اور فَن کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔

اِشتراکیت اور ترقّی پسندی سے متاثر ہوکر علی جواد زیدیؔ نے نظموں کی طرف زیادہ توجّہ دی مگر اُنہوں نے غزل کے دامن کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ غزل کی دِل کشی اُنہیں اپنی طرف مسلسل کھینچتی رہی اور وہ نظم وغزل کی تخلیقات کے سلسلے میں

ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔ ڈاکٹر عابد حُسین حیدری نے زیدؔی صاحب کی اِسی کشمکش کو بڑے سلیقے سے اُجاگر کیا ہے جس سے اُن کی غیر جانب داری اور تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''شاعر (علی جواد زیدؔی) ذہنی طَور پر کشمکش کا شکار ہے۔ ایک طرف اِشتراکیت و ترقّی پسندی سے وابستگی اُسے نظم کی مدح سرائی اور غزل سے کنارہ کشی پر مجبور کرتی ہے اور دوسری طرف غزل کی دِلکشی اپنی طرف کھینچتی ہے۔''

'علی جواد زیدؔی کی نظم گوئی' کے عنوان سے ترقّی پسند تحریک کے زیرِ اثر کہی گئی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر عابد حیدری اپنے دوٹوک انداز میں رقم طراز ہیں:

''یہ تمام کی تمام نظمیں دیکھا دیکھی اور فیشن کے طَور پر کہی گئیں اور اُن کے ذریعہ کمیونزم کا پرچار بھی دِل کھول کر کیا گیا۔ ایسی نظموں میں فنّی محاسن کم اور نعرہ بازی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں تخیّلی کس بَل سے الگ بنے بنائے سانچے میں ڈھال کر نِکالی گئیں۔ آگ، بجلی، خون، آندھی، طوفان، کل، کارخانہ، مزدور اور گولہ بارود جیسے گھن گرج والے الفاظ کی نمائندگی ایسی نظموں میں زیادہ کی گئی ہے لیکن اِس سے قطع نظر اس عہد میں ایسی تخلیقات بھی پیش کی گئیں جِن میں ایک رسیلا پن اور نرم و مانوس انداز بھی تھا اور ترقّی پسندی کے مخصوص اندازِ بیان سے ہٹ کر فن کو فن کی حیثیت سے برتا گیا اور شعری محاسن سے پہلو تہی نہیں کی گئی۔''

تنقید و تحقیق کے اِسی بے باک اور بے لاگ انداز کو پوری کتاب میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عابد حُسین حیدری بِلا شبہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے نہایت محنت و کاوش سے اِس تحقیقی و تنقیدی مقالہ کو ترتیب دِیا ہے۔ اس میں علی جواد زیدؔی کے تعارف کے ساتھ اُن کی غزل گوئی، نظم گوئی، شخصی مرثیہ کے علاوہ مثنوی، سلام، رباعی، قصیدہ، نعت اور منقبت وغیرہ کی اُن فنّی خصوصیات کا غیر جانب دارانہ انداز میں جائزہ لیا گیا ہے جِن میں سے بیشتر علمائے ادَب و فن کی نظروں سے پوشیدہ تھیں۔ 'علی جواد زیدؔی: ایک تعارف' کے عنوان سے مصنّف نے زیدؔی صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز، حالات و زمانہ کے زیرِ اثر نظریات میں ردّ و قبول اور ذہنی رویّوں کی نشان دہی کے علاوہ اُن کی نگارشات کا جامع تعارف بھی پیش کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں علی جواد زیدؔی سے ایک گفتگو کے عنوان سے مصنّف نے اُس اِنٹرویو کو بھی شامل کیا ہے جو اُنہوں نے زیدؔی صاحب کی وفات سے چند ماہ قبل لیا تھا۔ اِس انٹرویو سے زیدؔی صاحب کی شخصیت، کارناموں اور فَن سے متعلّق متعدّد گوشے وا ہوئے ہیں جو نہایت مفید اور پُر از معلومات ہیں۔ اِس اِنٹرویو کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مصنّف نے زیدؔی صاحب سے سوال کرنے کے بعد خود خاموش رہ کر اُنہیں اظہارِ خیال کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا ہے تا کہ قارئین کرام اُن کے اِظہارِ خیال سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں۔

ڈاکٹر عابد حُسین حیدری کا طرزِ تحریر کافی دِل چسپ ہے۔ اُن کی زبان نہایت صاف سُتھری اور سلیس ہے۔ وہ تحقیق و تنقید کی خشک زبان کو اپنے اسلوب کی روانی اور شگفتگی پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کو اُن کی بات سمجھنے

میں کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ مقالہ کے مطالعہ میں اُس کی دِل چسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ میرے نزدیک تنقید میں غیر جانب داری اور تحقیق میں تجسّس اِس مقالہ کی اہم خوبیاں ہیں۔ مجھے اُمّید ہے کہ رواں اور شستہ زبان میں تحریر کئے گئے اِس مقالہ کی ادَبی حلقوں نہ صرف خاطر خواہ پذیرائی ہوگی بلکہ اِس سے یہ بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ اگر وہ اِسی انہماک اور دیانت داری سے تحقیق وتنقید کے میدانِ کارزار میں ڈٹے رہے تو جلد ہی اپنی مُنفرد شناخت قائم کرنے اور نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر شریف احمد قریشی

ریڈر شعبۂ اُردو

گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج، رام پور

ابتدائیہ

زیدؔی نہ ہو خاموش کہ خوابیدہ ہے منزل
ہر قافلہ اک بانگ درا مانگ رہا ہے

اس شعر کے خالق علی جواد زیدؔی کا تعلق ترقی پسند شعراء کے ہراول دستے سے ہے۔ ممتاز ترقی پسند شاعر ہونے کے علاوہ زیدؔی نے مختلف موضوعات و مسائل پر مقالے اور مضامین لکھ کر نثری ادب کی بھی کافی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ آج مسلمہ طور پر ایک ادیب، مورخ، محقق اور ممتاز ناقد ہونے کے ساتھ ایک اہم شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی ادبی شخصیت اور شاعرانہ خدمات کے سلسلے میں تجزیہ و تنقید علی العموم عدم توازن کا شکار رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان کی ادبی اور شعری خدمات کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے اور اسی ضرورت کے تحت ان سطور کے لکھنے کی تحریک ہوئی۔ زیر نظر کتاب ''علی جواد زیدؔی: شخص اور شاعر'' دراصل میرے ایم۔اے سال آخر کے اس مختصر مقالے کی ترمیم و توسیع ہے جو استاد محترم پروفیسر سید محمود الحسن رضوی (سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) کی زیر نگرانی تکمیل کو پہنچا تھا۔ کچھ نامساعد حالات اور کچھ تساہل کے سبب یہ مقالہ طباعت کی منزلوں سے نہ گزر سکا کہ اسی بیچ زیدی صاحب پر حیدرآباد سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن انصاری عزمؔ کا تحقیقی مقالہ شائع ہوا۔ مقالے کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ

زیدیؔ صاحب کی تنقیدی و تحقیقی کاوشوں کا کماحقہ محاکمہ کرنے کے لئے مزید سعی کی ضرورت ہے۔اس بیچ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ میرے نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور پھر مقالے کی ورق گردانی کے بعد بہت سی چیزیں غیر ضروری معلوم ہوئیں اور بہت سی نئی چیزیں شامل کرنی پڑیں۔مقالے سے حیات،سیاسی وسماجی صورت حال، زیدیؔ کے عہد کا شعری منظر نامہ جو اس عہد کے دوسرے ترقی پسند شعراء پر لکھی گئی کتابوں میں موجود ہیں،حذف کر دیا گیا تا کہ اس کتاب کو غیر ضروری ضخامت سے بچایا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری کے انفرادی پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔زیدیؔ کا ترقی پسندی سے انحراف، جدیدیت کی طرف رجحان اور پھر اس ارتقائی سفر میں قدیم روایت کے صالح اقدار کو سینے سے لگانے اور ان سے ان کی اپنی شاعری میں انفرادیت کے نقوش ابھارنے کی داستان بیان کی گئی ہے۔جس کو عام طور سے ناقدین نے 'خدا ہی جانے کس مصلحت کی بناء پر' نظر انداز کر دیا تھا۔

زیر نظر کتاب میں ویسے تو شاعری کی مختلف اصناف مثنوی،قصیدہ،مرثیہ، سلام، رباعی اور نعت ومنقبت سے زیدیؔ کی دلچسپی اور درج بالا اصناف میں ان کے کارہائے کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے لیکن ان کی غزلوں اور نظموں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں ان کے اجتہادی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔آخر میں اختتامیہ کے عنوان سے ناقدین ادب کی آراء اور زیر نظر کتاب کی معروضی تنقید کے پس منظر میں علی جواد زیدیؔ کی مجموعی خدمات کا محاکمہ کرتے ہوئے اردو ادب میں ان کے شاعرانہ قد وقامت کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کوشش میں ناچیز کو کس حد تک کامیابی ملی اس کا فیصلہ زیدیؔ کی

ایک رباعی کے ساتھ زیدؔی شناسوں پر چھوڑتا ہوں:

تخلیق سے جام شعر بھرتا ہوں
خاروں سے گلوں کی بات کرتا ہوں
اغیار کی تنقید تو ہے دعوت فکر
تحسین سے دوستوں کی ڈرتا ہوں

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں کسی نہ کسی عنوان سے مدد کی ہے خصوصاً اساتذہ میں پروفیسر نیر مسعود رضوی، پروفیسر محمود الحسن رضوی، ڈاکٹر سید سلیمان حسین اور پروفیسر انیس اشفاق عابدی کا شکریہ اس لئے ضروری ہے کہ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ اپنے ذخیرے سے کتابیں عطا کر کے میری مشکل آسان کی بلکہ بہت سے اشعار کی تفہیم و تعبیر میں بھی میری رہنمائی کی ان اساتذہ کی رہنمائی کے بغیر یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ رب العزت بطفیل محمدؐ و آل محمدؐ ان حضرات کا سایہ ہم پر زیادہ سے زیادہ دنوں تک باقی رکھے تا کہ زیادہ سے زیادہ ادب کے طلاب ان سے فیضیاب ہو سکیں۔

دیگر کرم فرماؤں میں ڈاکٹر عارف حسن خاں (صدر شعبۂ اردو ہندو کالج مرادآباد)، ڈاکٹر طارق سعید (صدر شعبۂ اردو ساکیت پی.جی. کالج ایودھیا فیض آباد)، ڈاکٹر شریف احمد قریشی (ریڈر شعبۂ اردو گورنمنٹ رضا پی.جی. کالج رام پور)، ڈاکٹر نسیم الظفر، جناب فدا حسین حسینی، ڈاکٹر سید احتشام حسین ٹانڈوی (ریڈر شعبۂ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ)، ڈاکٹر طلعت حسین نقوی (ریڈر شعبۂ اردو گنپت سہائے پی.جی. کالج سلطان پور) ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی، جناب عرفان زنگی پوری،

ڈاکٹر ظفر النقی (لکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج محمد آباد گہنہ) ڈاکٹر ثوبان سعید، جناب کیفی سنبھلی، ڈاکٹر اکبر مہدی مظفر (لیکچرر شعبۂ اردو ساکیت پی.جی.کالج ایودھیا) ڈاکٹر شہزاد احمد، ڈاکٹر منور تابش، میر شاہ حسین عارف، عزیزم منتظر مہدی، علی عباس و محمد عالم سلمہٗ اور اعظم علی (پپّی کمپیوٹر گرافکس سنبھل) کا بھی شکریہ۔ جن کی ہمت افزائی، تقاضوں اور مدد کی وجہ سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔

10/نومبر، 2008ء

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

صدر شعبۂ اردو

ایم۔جی۔ایم (پی۔جی) کالج

سنبھل ضلع مرادآباد (یو.پی)

علی جواد زیدیؔ: ایک تعارف

علی جواد زیدیؔ کا تعلق ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے سے ہے۔ان کی متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کو دیکھتے ہوئے اقبالؔ کا درج ذیل شعر بالکل صحیح صادق آتا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبالؔ کا یہ شعر پڑھ کر ذہن بار بار سوچتا ہے کہ نہ جانے حیات وعلم کے چمن میں نرگس اپنی بے نوری پر کتنے برس روئی ہوگی تب جا کے علی جواد زیدیؔ جیسا ایک دیدہ ور پیدا ہوا ہوگا۔دیدہ ور تو بہت تھے اور ہیں۔ع

لیکن تو چیزے دیگری

دیدہ وروں کے بھی مدارج اور حد بندیاں ہیں۔بعض دیدہ وروں کی دیدہ وری کسی ایک خاص علم وفن تک محدود ہوتی ہے لیکن علی جواد زیدیؔ متعدد علوم و فنون پر حاوی تھے۔علی جواد زیدیؔ ہمہ گیر شخصیت کا نام ہے ان کی اولین شناخت شاعری ہے مگر وہ تو سیاست سے صحافت تک، شاعری سے ادبی تاریخ وتنقید تک، ثقافت سے سماجیات تک کسی موضوع میں بند نہیں ہیں۔عمر کی آخری منزلوں میں بھی ان میں کام کرنے کا جذبہ جوان تھا اور ہم نوجوانوں کے لئے ان کا وقیع اور متنوع کارنامہ مشعل راہ ہے۔زیدیؔ کی سب سے پہلی تخلیق ۱۹۲۸ء میں 'المصطفیٰ' جونپور میں شائع ہوئی تھی۔تقریباً ۵۷ برس کے فاصلے پر محیط مسلسل کاروبار علم وادب کی بنا پر ان

کے لئے دنیائے ادب میں ایک مستقل جگہ بن گئی تھی اور وہ مسلمہ طور پر اردو دنیا میں ایک بلند پایہ ناقد، محقق اور شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں انہوں نے کم وبیش اسی کتابیں اور تین سو سے زائد مضامین لکھے ہیں۔

علی جواد زیدی ۱۰/مارچ ۱۹۱۶ء کو کرہاں ضلع مئو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم عربی وفارسی کی گھر پر حاصل کی۔ کچھ مہینے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں بھی گذارے لیکن اچانک ۱۹۲۹ء میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ گھر والوں نے عربی کے بجائے انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا اور محمود آباد کالون ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں وہیں سے ہائی اسکول کیا پھر گورنمنٹ جبلی کالج لکھنؤ سے ۱۹۳۷ء میں انٹر میڈیٹ اور ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ جدو جہد آزادی میں گرفتاری کے باعث ایک سال ضائع ہوا اور ۱۹۴۲ء میں ایل ایل بی پاس کیا۔ علم و ادب اور شعر وشاعری سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ تاریخ اور اسلامیات سے بھی خاص شغف رہا۔ لکھنؤ آزادی کی تحریک کا ایک اہم مرکز تھا نوجوان اس میں پیش پیش مگر غیر منظّم تھے اس جذبہ کے تحت آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد ہوئی۔ زیدیؔ اس کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے پھر آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ زیدی جلد ہی لکھنؤ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر چن لئے گئے پھر یوپی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نائب صدر، اودھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مجلس استقبالیہ، آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری اور آخر کار ۱۹۴۱ء کے اجلاس پٹنہ میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری منتخب کئے گئے۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے ہندوستان کی پہلی آل انڈیا طالبات کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی۔

دوسری جنگ عظیم کے پر آشوب دور میں ان کی قیادت میں لکھنؤ اور اطراف میں طالب علموں کی متعدد ہڑتالیں ہوئیں لیکن ان میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سر مارس گائر کے خلاف مظاہرہ جس پیمانے پر ہوا وہ یادگار رہے گا۔ زیدیؔ کا رول رہبرانہ تھا۔ اس جرم میں گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا لیکن طلباء میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوجانے کی وجہ سے گرفتاری ملتوی کردی گئی پھر بھی ان کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں آخر دوسرا وارنٹ گرفتاری ایک باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں نکالا گیا اور جب وہ ناگپور میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کر رہے تھے تو انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ وہاں سے مقدمہ کی سماعت کے لئے لکھنؤ لایا گیا۔ انہوں نے عدالت میں مقدمہ کی پیروی سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ برطانوی عدالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس مقدمہ کی سماعت کے دوران آچاریہ نریندر دیو خاص طور سے لکھنؤ ضلع جیل میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے زیدیؔ کے بیان پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ زیدیؔ کو سزا سنائی گئی اور وہ لکھنؤ سے بنارس سینٹرل جیل بھیج دیے گئے۔

رہائی کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری مکمل کی۔ زیدیؔ کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے تھے اور اب صحافت یا وکالت دو ہی شعبے رہ گئے تھے۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد اعظم گڑھ میں اقبال احمد سہیلؔ سے جو شاعر ہونے کے علاوہ چوٹی کے وکیل بھی تھے وکالت کی عملی ٹریننگ لی۔ لیکن وہاں کی وکالت سے غیر مطمئن تھے۔ لہٰذا دہلی جا کر ایک خبر رساں ایجنسی کے ایڈیٹر ہوگئے بعد میں اس سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ آخر کار اپنے عزیز سید بشیر حسن عابدی مرحوم کے مشورے پر جو غازی پور میں دیوانی کے معروف و ممتاز وکیل تھے

وکالت شروع کردی اور وہاں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۴۶ء میں زیدیؔ سیکشن افسر انچارج اردو جرنلسٹ کی حیثیت سے حکومت اتر پردیش میں داخل ہوئے۔ پبلیکیشنز افسر، اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدوں پر مامور رہنے کے بعد جنوری ۱۹۵۶ء میں یونین پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہوکر حکومت ہند میں چلے گئے۔ اپریل ۱۹۵۷ء میں زیدیؔ جموں وکشمیر گئے وہاں ریجنل افسر اور انفارمیشن افسر کے عہدوں پر بہ یک وقت فائز رہے۔ وہیں حکومت ہند نے ان کی خدمات حکومت جموں وکشمیر کو مستعار دیدیں اور وہ وزیر اعلیٰ کے خصوصی سکریٹری اور محکمہ جات اطلاعات وتواضع کے بھی سکریٹری رہے۔ اسی زمانے میں وہ جموں وکشمیر اکیڈمی کے بھی سکریٹری رہے وہاں سے ۱۹۶۲ء میں دہلی آئے۔ ۱۹۶۷ء سے ڈھائی برس ممبئی میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن افسر برائے مہاراشٹر وگوا رہے۔ پھر دہلی آئے اور وہاں ۱۹۷۵ء تک قیام کیا۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک چار برس کا طویل عرصہ آل انڈیا ریڈیو کے نمائندۂ خصوصی کی حیثیت سے مغربی ایشیا میں گذارا۔ جس کا ہیڈکواٹر تہران (ایران) تھا اور یہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔

وظیفہ یابی کے بعد زیدیؔ کا قیام علی گڑھ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں زیدیؔ بڑے انہماک سے تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے اور مولانا آزاد سینٹرل لائبریری کے عظیم الشان ذخیرہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بحیثیت محقق و ناقد اپنی شناخت قائم کی۔ ۱۹۸۱ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کے صدر نامزد کئے گئے۔ چونکہ علی گڑھ سے لکھنؤ بار بار آنا دشوار تھا اس لئے زیدیؔ نے لکھنؤ میں سکونت کا فیصلہ کیا۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کا دور صدارت اور پروفیسر محمود الٰہی کی چیئرمینی وہ قران السعدین تھی جو یادگار اہمیت کی حامل ہے اس دور میں اردو اکیڈمی نے ترقی کی وہ

منزلیں طے کیں جو یادگار رہیں گی۔ خاص طور سے اکیڈمی نے وہ اہم کتابیں شائع کیں جو نادر و نایاب تھیں اس لئے اس دور کو اکیڈمی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔

زیدی کا ایک اہم کارنامہ حکومت اتر پردیش کی طرف سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'نیا دور' کا اجرا ہے۔ اسی طرح جموں و کشمیر سے دو ماہی 'شیرازہ' اور اپنے دور صدارت میں اتر پردیش اردو اکیڈمی سے دو ماہی 'اکادمی' کا اجرا بھی قابل ذکر ہے۔ ممبئی کی سکونت کے دوران زینبیہ انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے دو ماہی 'العلم' جاری کرایا جس کے روح رواں ڈاکٹر سید اختر حسن رضوی (رضوی بلڈرس) تھے اور زیدیؔ اس رسالے کے اعزازی مدیر تھے۔ اس کے مرثیہ نمبر، مرثیہ و سلام نمبر، شہادت نمبر اور نعت خیر المرسلین نمبر کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ راقم السطور اس رسالے کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔

زیدیؔ کی زندگی نے کتنے پلٹے کھائے۔ جاگیرداری سے مارکسیت تک، عقیدت سے تشکیک تک، سیاست سے صحافت اور آخر کار وکالت و ملازمت تک کتنے نشیب و فراز دیکھے، ہندوستان کا چپہ چپہ چھانا، ہر طبقے اور ہر حلقے کا قریب سے مشاہدہ کیا اور ان مشاہدات کو اپنی تصانیف و مضامین اور شاعری میں محفوظ کر دیا۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں بیرون ملک کا پہلا سفر ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر جمہوریۂ ہند) کے ساتھ افغانستان کا کیا۔ ۱۹۷۰ء میں ایک عالمی سفر کیا اور اسی سال شکاگو یونیورسٹی میں خاندانی منصوبہ بندی پر چار ماہ کے بین الاقوامی ورکشاپ میں شرکت کر کے خصوصی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک زیدیؔ مغربی ایشیاء میں آل انڈیا ریڈیو کے نمائندۂ خصوصی رہے۔ جس کا مرکزی مقام تہران (ایران) تھا اور وہاں

سے افغانستان، کویت، بحرین، عمان، قطر، شارجہ، دوبئ، ابوذہبی، شمالی یمن کا سفر کیا۔ پاکستان میں لاہور اور راولپنڈی وغیرہ تقسیم وطن سے پہلے بھی جا چکے تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد پاکستان کا پہلا سفر ۱۹۸۲ء میں اور دوسرا ۱۹۸۴ء میں کیا اور وہاں ایک وسیع علمی وادبی حلقے میں پذیرائی ہوئی۔ اسی وجہ سے زیدیؔ کی شاعری میں سفر، راہی، منزل، رہبر، رہزن، دشت، گلزار، شجر، ریگزار، خارزار، طوفان گرد اور اس قبیل کی کئی جدید علامتیں مثلاً طیارہ، مستقر، دوش ہوا وغیرہ نئی معنویت کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ ان کے یہاں کوئی منزل آخر نہیں بلکہ سفر، مدام سفر اور ہمیشہ بڑھتے رہنے کا رجائی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

علی جواد زیدیؔ نے تقریباً اسی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے زیادہ تر شائع ہو چکی ہیں اور کچھ منتظر اشاعت ہیں۔ زیدیؔ کی آٹھ کتابوں (۱) تعمیری ادب (۲) آپ سے ملئے (۳) دوادبی اسکول (۴) اردو میں قومی شاعری کے سو سال (۵) نسیم دشت آرزو (۶) دہلوی مرثیہ گو جلد اول (۷) دہلوی مرثیہ گو جلد دوم (۸) فکر و ریاض وغیرہ پر حکومت یا اکیڈمیوں سے انعامات ملے ہیں۔ انفرادی کتابوں پر انعامات کے علاوہ اتر پردیش اردو اکیڈمی نے مجموعی خدمات پر دس ہزار روپئے اور غالبؔ انسٹیٹیوٹ دہلی نے فارسی اور اردو میں مجموعی تحقیقی اکتسابات پر پندرہ ہزار روپئے اور توحید المسلمین ٹرسٹ لکھنؤ نے رثائی خدمات پر 'انیسؔ ایوارڈ' اور دس ہزار روپئے کا انعام دیا۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کی طرف سے 'پدم شری' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ زیدیؔ نے 'ضبط شدہ نظمیں' کے عنوان سے برطانوی حکومت کے ذریعہ ضبط کی گئی نظموں کو بھی بڑی عرق ریزی سے جمع کر کے شائع کیا جس کی رونمائی

اس وقت کی وزیراعظم آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی نے کی تھی۔

علی جواد زیدیؔ کی ادبی خدمات پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے پروفیسر مغنی تبسم کی نگرانی میں عزیز الرحمٰن عزمؔ انصاری نے اور محمد سجاد نے رانچی یونیورسٹی جھارکھنڈ سے پروفیسر وہاب اشرفی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔اس کے علاوہ راقم السطور نے 'علی جواد زیدی شخص اور شاعر' کے عنوان سے زیر نظر کتاب مرتب کی ہے۔زیدیؔ نے اردو کے تمام اصناف خصوصاً مثنوی، نعت، قصیدہ، سلام، رباعی، مرثیہ اور غزل پر خاصا لکھا ہے۔تاریخ ادب اردو بھی ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔انہوں نے اردو ادب کی عام تاریخوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ادب کی تاریخ کیسے مرتب کی جائے کہ ہمہ جہاتی اور متوازن ہو۔ساہتیہ اکیڈمی حکومت ہند کے لئے انگریزی زبان میں 'اردو ادب کی تاریخ' مرتب کی ہے جس کا ملک کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔بعض حضرات نے دہلی اور لکھنؤ کے جو دو اسکول وضع کر لئے تھے ان ہوائی قلعوں کو زیدیؔ نے مضبوط اور ٹھوس دلیلوں سے مسمار کر دیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے جو دو اسکول تسلیم کر لئے گئے ہیں وہ صرف دو ادبی مراکز تھے اسکول نہیں تھے۔اور اس سلسلے کی ان کی تصنیف 'دو ادبی اسکول' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔رثائی ادب میں 'دہلوی مرثیہ گو' (جلد اول، جلد دوم) لکھ کر زیدی نے دکنی اور لکھنوی مرثیوں کے درمیان کی کڑی فراہم کر دی ہے اور اب مرثیہ گوئی کی مسلسل تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔زیدیؔ کو کشمیر اور کشمیری ادب سے بھی دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے دیوان غنیؔ کشمیری کی ترتیب و تدوین کے علاوہ کئی اور مفید مضامین سپرد قلم کئے تھے جسے راقم السطور نے ۱۹۹۰ء میں 'ادبیات کشمیر' کے عنوان سے

ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

آزادی سے متعلق ادبی مواد کی فراہمی میں بھی زیدیؔ نے بڑی دلچسپی سے کام لیا اور اس موضوع پر 'اردو میں قومی شاعری کے سو سال' ایک معرکۃ الآراء کارنامہ ہے جسے ادب آزادی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے بعد میں اس پر مزید مواد فراہم کیا جس کی پہلی جلد 'ہماری قومی شاعری' کے عنوان سے آزادیٔ ہند کی گولڈن جبلی کے موقع پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کے وقت اتر پردیش اردو اکیڈمی سے زیدیؔ نے راقم السطور کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور راقم نے بحیثیت ریسرچ فیلو کے زیدیؔ کے ساتھ کام کیا۔ اس حوالے سے راقم السطور کو ہندوستان کی تمام اہم لائبریریوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور تحقیق وتنقید سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ زیدی کی تالیف 'تاریخ مشاعرہ' بھی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے جو اردو میں مشاعرہ کی تاریخ پر ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ رامائن اور بھگوت گیتا پر بھی بہت مفید معلومات یکجا کی تھیں اور کچھ دنوں پہلے کولکاتا کے ایک ادارہ نے رامائن کے پروجیکٹ کو منظوری دے دی تھی اور زیدیؔ باوجود کبرسنی کے یہ کام بھی بڑی حسن وخوبی سے انجام دے رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کام مکمل ہوا یا نہیں۔ اس کے علاوہ زیدیؔ نے انگریزی، ہندی، ڈوگری اور عربی وفارسی سے تراجم بھی کئے ہیں۔

قصیدہ نگاران اتر پردیش، نعت نگاری، مثنوی نگاری، نثر نگاری ایسے تذکرے ہیں جن سے اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ان کی دو اہم کتابیں (۱) جدید مرثیہ کے بانی میر مظفر حسین ضمیرؔ لکھنوی اور (۲) مرثیہ نگاران اتر پردیش شائع ہوئی ہیں۔

علی جواد زیدیؔ کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتداء میں جرمؔ محمد آبادی کو اپنا کلام دکھایا تھا اور دو غزلیں عزیزؔ لکھنوی کی نظر سے بھی گزاری تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے شاعری سے ابتداء کی اور آخری عمر تک شعر کہتے تھے لیکن تحقیق و تنقید سے دلچسپی کے سبب انہوں نے مدت سے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا تھا پھر بھی کبھی کبھی لکھتے اور چھپواتے رہتے تھے۔ ان کا شعری ذخیرہ باوزن اور وقیع ہے اور پروفیسر احتشام حسین مابلی، فراقؔ گورکھپوری، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمیؔ، سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، آل احمد سرورؔ، جعفر علی خاں اثرؔ، اقبال احمد سہیلؔ، محمد علی صدیقی جیسے صاحبان نظر نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بالخصوص ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں ان کا متوازن لہجہ اور شعری آہنگ کم ہی ہم عصروں کو نصیب ہوا۔ جدت پسندی کے دور میں بھی وہ اپنے کو لئے دئے رہے اور ہمیں اچھی نظموں سے نوازا۔ علی جواد زیدیؔ شاعر اور محقق کے علاوہ ایک بلند پایہ ناقد بھی تھے جن کے یہاں جدید و قدیم رجحانات و احساسات کا حیرت انگیز امتزاج ہے۔ خاکہ نگاری میں علی جواد زیدیؔ نے خاکہ کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اہمیت کو تسلیم کرایا ہے۔ آپ سے ملئے، ہم قبیلہ اور اہل قبیلہ کے خاکے خاکہ نگاری کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ سلام گوئی اور رباعی کے فن پر ان کے سیر حاصل مقدمات اپنی جگہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور رباعی اور سلام پر کام کرنے والوں کے لئے بنیادی مواد بھی فراہم کر دیا ہے۔ ادھر کئی برسوں سے جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت زیدؑ شہید پر انگریزی میں کتاب لکھ رہے تھے۔ لیکن موت نے اس کی تکمیل کی مہلت نہ دی۔ کاش ان کے صاحبزادگان سید وقار امجاد

زیدی، سید سراج امجاد زیدی اور سید انوار امجاد زیدی اس طرف خصوصی توجہ دیتے تا کہ زیدیؔ صاحب کی یہ محنت رائیگاں نہ ہو۔ زیدیؔ صاحب کے متنوع اور وقیع کارناموں کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مصروف ترین ملازمت (محکمۂ اطلاعات) کے باوجود انہوں نے اتنی کتابیں اور مضامین کس طرح تصنیف کر ڈالے۔ راقم السطور کو لگ بھگ سولہ سال زیدیؔ صاحب کی معیت میں گزارنے کا موقع ملا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ زیدیؔ صاحب بلا ناغہ صبح چار بجے اٹھ جاتے، چائے پیتے اور نماز صبح ادا کرتے اور صبح نو بجے تک مسلسل کام کرتے رہتے تھے اور یہ طریقۂ کار صرف حضر ہی نہیں سفر میں بھی جاری و ساری رہتا تھا۔ بہر حال زیدی صاحب کو علم و ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ غرض زیدیؔ کے متنوع اور ہمہ گیر علمی کارناموں کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ طور پر میرؔ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

۶/ دسمبر ۲۰۰۴ء کا دن وہ منحوس دن تھا جس دن یہ قومی مجاہد، بلند پایہ شاعر و ادیب، عظیم محقق و ناقد، اردو کا جانثار اور قوم و ملت کا فدائی ہم سے جدا ہو گیا۔ ع

رہے نام اللہ کا

علی جواد زیدیؔ کی غزل گوئی

علی جواد زیدیؔ کا شمار عام طور سے ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ کسی سکہ بند قسم کے نظریات کے حامی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کلاسیکیت سے لے کر جدیدیت تک کے تمام عناصر موجود ہیں اور ان کی یہی خوبی ان کی شناخت کا عنوان بن گئی۔

علی جواد زیدیؔ کی غزل گوئی پر تبصرہ کرنے سے پیشتر یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ چند باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ علی جواد زیدیؔ نظم کے شاعر ہیں اور غزل کی بعض خوبیوں کے معترف ہونے کے باوجود اسے غیر مفید تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون 'غزل نرغے میں' مشمولہ 'تعمیری ادب' میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:

> ''اب وہ سیاسی اور معاشرتی حالات بالکل ہی نہیں رہ گئے ہیں جن میں اردو غزل کی نشو ونما ہوئی تھی۔ اب غزل کی فضیلت پر اصرار کرنا اردو ادب کی راہ ترقی میں روڑے اٹکانا ہے۔''

علی جواد زیدیؔ کا یہ کہنا کہ اب وہ سیاسی و معاشرتی حالات بالکل ہی نہیں رہ گئے جن میں غزل کی نشو ونما ہوئی تھی اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ موجودہ دور میں غزل کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے، حقیقت سے چشم پوشی کے مرادف ہے اس لئے

کہ سیاسی اور معاشرتی صورت حال کے تبدیل ہونے سے انسان کے فطری جذبات و احساسات تبدیل نہیں ہوتے ۔ سیاسی اور معاشرتی صورت حال نے ابتدائے اردو سے اب تک نہ جانے کتنے پلٹے کھائے مگر غزل ہر دور میں کم و بیش مقبول رہی اور زمانے کے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر اس کے دوش بہ دوش ترقی کرتی رہی ۔ یہ ضرور ہے کہ جب غزل میں اصلاحات کا عمل دخل زیادہ ہوا اور غزل اپنے فطری مزاج سے دور ہوئی تو اس کا وار ہلکا ہو گیا، مگر موجود ہر دور میں رہی ۔ حالؔی و آزادؔ وغیرہ کی نظم آزاد کی تحریکات کے باوصف غزل سے مکمل کنارہ کشی نہ ہو سکی اور غزل کہی جاتی رہی ۔ خود ترقی پسندوں نے بھی نظم کی مدح سرائی کے باوصف غزل سے مکمل کنارہ کشی نہیں کی جس کا اندازہ مجازؔ، سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، وامقؔ جونپوری، مجروحؔ سلطان پوری اور خود علی جواد زیدیؔ وغیرہ کے مجموعہ ہائے کلام کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے ۔ ایک دوسری جگہ علی جواد زیدیؔ رقم طراز ہیں:

> ''چکبستؔ ، اقبالؔ، اکبرؔ، جوشؔ وغیرہ نے .....
> غزل کے دامن کو وسیع تر کیا ہے.....لیکن ان مضامین نے غزل کی تنگ دامانی کو اور بھی ابھارا ہی ہے، دبایا نہیں ہے ۔ غزل اپنی ہیئت اور اپنے مزاج دونوں سے مجبور ہے وہ ایک دائرہ ہی میں ہر پھر کے قدم رکھتی رہے گی اور اسی لئے اپنی افادیت کو زیادہ دنوں تک قائم نہیں رکھ سکے گی ۔''

علی جواد زیدیؔ کا یہ کہنا کہ اقبالؔ وغیرہ نے غزل کے دامن کو وسیع تر کیا لیکن اس سے غزل کی تنگ دامانی کا احساس اور بڑھا، اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے

کہ غزل کے دامن میں وسعت تھی جسے اپنے امکان بھر شعرائے ماسبق نے وسیع کیا۔ ان کے بعد آنے والوں کو تنگ دامانی کا احساس ہوا۔ اس لئے انہوں نے اسے وسیع اور کارآمد بنانے کے بجائے دوسری اصناف کو اختیار کیا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ غزل کا دامن اب بالکل تنگ ہے اور اس میں نئے خیالات ونظریات پیش کرنے کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ اگر ایسا ہوتا تو جدید دور میں غزل کی شکست وریخت کا عمل وجود میں نہ آتا۔

جدید دور میں شکست وریخت کے عمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غزل کے دامن میں امکانات موجود تھے جنہیں اس عہد کے شعراء بروئے کار نہیں لا سکے۔ غزل کو ایک ہی دائرے میں محدود کرنا علی جواد زیدیؔ کی نظم سے وابستگی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ورنہ غزل اپنے ذات وکائنات کے تمام مسائل کو پیش کرنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتی ہے اور علی جواد زیدیؔ کا یہ کہنا بھی ان کی بالغ نظری کے منافی معلوم ہوتا ہے کہ غزل اپنی افادیت کو زیادہ دنوں تک قائم نہ رکھ سکے گی۔

غزل کے سلسلے میں علی جواد زیدیؔ کے ان نظریات کے بعد جب ہم ان کے مجموعۂ کلام 'نسیم دشت آرزو' پر نظر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاعر ذہنی طور پر کشمکش کا شکار ہے۔ ایک طرف اشتراکیت وترقی پسندی سے وابستگی اسے نظم کی مدح سرائی اور غزل سے کنارہ کشی پر مجبور کرتی ہے اور دوسری طرف غزل کی دلکشی اپنی طرف کھینچتی ہے زیدیؔ کی اس ذہنی کشمکش کا اندازہ 'نسیم دشت آرزو' کے مقدمے کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

'غزل کو سب کچھ سمجھ لینا یا دوسرے اصناف کو پست تر گردانا،

ادب کی رنگارنگی، گہرائی وتوانائی اور ہمہ گیری سے انکار کرنا ہے اور
ادب کے کلی تصور سے عدم تعلق کا اظہار کرنا ہے اور یہ بھی ویسی ہی
غلطی ہے جیسے غزل کو ماضی کی چیز قرار دینا۔ میں نے غزلوں سے
زیادہ نظمیں کہیں ہے اور میں نظموں کی اہمیت اور کئی معنوں میں
افضلیت کا قائل ہوں۔ لیکن یہ افضلیت ان تصورات پر مبنی نہیں
ہے جن کا مقصد غزل کے جمالیاتی پہلو کا انکار ہو۔'

اور چونکہ زیدیؔ غزل کے جمالیاتی پہلوؤں کے قائل ہیں اس لئے ان کے دل کی بات شعری قالب اختیار کر لیتے ہیں:

چھیڑ بھی کوئی غزل زیدیؔ کی فرط درد سے
یاس کا اک رنگ میری داستاں تک آ گیا
کسی غزل کا کوئی شعر گنگنا تے چلیں
طویل راہیں وفا کی ہیں اور سفر تنہا

☆

اور لہرا کے چلی شمع غزل اے زیدیؔ
جب فراقؔ و اثرؔ و یاسؔ و جگرؔ تک پہنچی

☆

درج بالا اشعار سے آپ خود محسوس کر سکتے ہیں کہ شاعر کو غزل کی ضرورت اور ترقی کا احساس ہے اور اسی احساس نے علی جواد زیدیؔ سے بیشمار غزلیں کہلوائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں تہذیبی اقدار اور فنی

روایات سے بالکلیہ انحراف نہ کر کے جدید تہذیبی دھاروں اور سماجی محرکات سے اکتساب فیض کر کے اپنے تجربوں کو غزل میں سمویا۔ جس کا اعتراف زیدیؔ نے اپنے مجموعہ 'نسیم دشت آرزو' کے مقدمہ میں خود کیا ہے:

'غزل کی خصوصیت اس کی ایجازی آفاقیت میں پنہاں ہے۔ عشق ہو، کشف ذات ہو، جذبہ بے اختیار شوق ہو، جذبۂ قربانی وشہادت ہو، ذوق تعمیر ہو، نعرۂ انقلاب ہو، ارتقاء و ترقی کی خواہش ہو، ظلم و جور سے جنگ ہو، کیفیت سرمستی و رندی ہو، حسن کی پہلو داری ہو، یہ اور ایسی بہت سی کیفیتیں ہیں جنہیں وقت دندھلا نہیں کر پایا ہے۔ یہ ہر دور میں روپ بدل بدل کی سامنے آتی ہیں۔ لفظیات وحسیات بدل جانے کے بعد بھی یہ اساسی کیفیات ذہن انسانی کو متاثر کرتی ہیں۔ اس کے اعمال کو متاثر کرتی ہیں اور زمان ومکان کے سرے صدیوں سے ملا دیتی ہیں۔ یہ ازلی آفاقیت انسانی اخلاق و افکار کی تعمیر کرتی ہے اور ہر تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ غزل انہیں آفاقی عناصر سے ریزے چنتی ہے اور ماضی کو حال و مستقبل میں پیوست کر کے جوان بنائے رکھتی ہے۔ لہجوں کی تبدیلی اور فکری عناصر کی سطحوں میں تبدیلی کے باوجود، وقت کے تیز دھاروں میں بہہ جانے والے انسان کو یہی آفاقی عناصر سنبھالے ہوئے ہیں۔'

علی جواد زیدیؔ کی غزلوں کے مطالعے کے بعد یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ علی جواد زیدیؔ کی غزلوں میں کلاسیکی عناصر کی جہاں جلوہ افروزی ہے وہیں انہوں نے اردو غزل میں ہندی عناصر شامل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔انہوں نے ہندی لفظیات و تراکیب ، ہندی علامات وغیرہ کا استعمال غزل میں اس طرح کیا ہے جو غزل کے مزاج سے بہت قریب ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر دیکھیں:

بوندوں کی رم جھم پر ناچی ساون کی متوالی رات
کتنی تنہا کتنی بھیانک ڈس لے گی یہ کالی رات

☆

جھلمل جھلمل جگمگ جگمگ ہر آنسو اک جلتا دیپ
فرقت کی سونی نگری میں یادوں کی دیوالی رات

☆

وہ جادو کی آنکھیں جانیں یا غم کی پتھرائی آنکھ
یا تو زہر کا پیالہ ہوگی یا مدھورس کی پیالی رات

☆

گنگ و جمن سے وادیٔ نیل و فرات تک
اک قطرہ اشک تھا جو مجھے یم بہ یم ملا

علی جواد زیدیؔ نے ابتداء سے لے کر انتہا تک غزل کے مزاج کو مدنظر رکھا ہے اور غزل کے مزاج وآہنگ سے الگ ہٹنے کی کوشش نہیں کی ہے۔وہ مسائل کے

اظہار کے لئے علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں کا سہارا لینے میں ہچکچاتے نہیں۔ انہیں یہ بھی خوف نہیں ستاتا کہ ترقی پسند ان پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر غزل میں علامت واستعارہ سے کنارہ کشی اختیار کی گئی تو معنویت کا دائرہ محدود ہو جائے گا اور اس طرح کی شاعری دیرپا نہیں ہوتی۔ علی جواد زیدیؔ کا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قدیم علامتوں کو نئے طور پر برتا ہے اور نئی معنویت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نہ جانے بھیگی ہیں پلکیں یہ کیوں دم رخصت
کہ گھر میں بھی تو رہا ہوں میں عمر بھر تنہا

☆

اس اندھیرے کی گھٹن سے تو کہیں بہتر ہے
گھر ہی جل جائے کہ دم بھر کو اجالا ہوگا
شہروں کا یہ ہجوم بھی صحرا دکھائی دے
جو اس میں آ پھنسا وہ پرایا دکھائی دے

☆

صحرا میں کتنے اہل وفا تشنہ لب رہے
دریا کو تھی تلاش کہ پیاسا دکھائی دے

☆

یہ تازہ تازہ قفس کیا خزاں سے کچھ کم ہیں
ہجوم گل ہی سے اندازۂ بہار نہ کر

قدیم لفظیات و علامات کے ساتھ ساتھ علی جواد زیدیؔ نے ترقی پسندوں کی بعض مخصوص لفظیات و علامات کو بھی استعمال کیا ہے اور اپنے معاصرین کے مقابلے معنوی امکانات کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوششیں کی ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعہ اس عہد کی تاریخ کو زندہ رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے:

اپنی محرومی پہ کیا اہل تماشہ روئے
کیے دیوانوں نے جس دم رسن و دار پسند

☆

نہ اہل زر کو نظر میں لائی نہ اہل منبر کے پاس آئی
جو اردار و صلیب ہی میں ملی بقائے دوام اکثر

☆

دلوں سے آج خیال نمود و بود گیا
صلیب پر کوئی پڑھتا ہوا درود گیا

☆

یہ تموج یہ تلاطم یہ شہادت یہ شہود
ختم ہے منزل اول کا سفر میرے بعد

☆

آنکھوں آنکھوں میں بھی کٹ جائے تو ہم راضی ہیں
یہ اندھیرا ہے بس اک رات بسر ہونے تک

اٹھ پڑا جب فتنۂ دار و صلیب
میری غیرت کو جلال آ ہی گیا

☆

عجیب سا ہے یہ احساس انقلاب کے بعد
کہ جیسے اب بھی کوئی انقلاب ہو نہ سکا

☆

روش روش سے الجھتی رہی ہے بادِ سموم
بہار نو کا مگر سد باب ہو نہ سکا

☆

علی جواد زیدیؔ کی غزلوں میں آزادی اور رجائیت کا تصور بھی اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ ہر نفی میں اثبات کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دنیا والوں کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ آرزو، خواہش اور تمنا زندگی ہے اور قنوطیت و یاسیت موت ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

برت لو یار و برتنے کی چیز ہے یہ حیات
ہو لاکھ ترسی ہوئی تلخ مختصر تنہا

☆

ہر ایک حال میں جینے کا جگمگانے کا شوق
اندھیری شب میں ستاروں کی انجمن سے ملا

☆

وہ حوصلہ جو نئی راہ کی تلاش میں ہے
گلی گلی میں بھٹکتی ہوئی کرن سے ملا

☆

خودی ہے بحرِ تمنا کی موج طوفانی
جھکی جبین اٹھی جذبۂ جمود گیا

☆

بجھانا چاہا تھا سو بار آندھیوں نے جسے
اندھیری رات میں جلتا ہے وہ چراغ ہنوز

☆

خزاں کے بعد بھی ہے جوشِ گل وہی زیدیؔ
وہی بہار وہی ہے فضائے باغ ہنوز

☆

اک کرن پھوٹے گی اک شوخ ہوا سنکے گی
اسی امید میں جاگے ہیں سحر ہونے تک

☆

شکستہ لاکھ تھی کشتی ہزار تھا طوفاں
کسی خیال کا دامن تو تھام لینا تھا

رجائیت اور توانائی کے ساتھ ساتھ علی جواد زیدیؔ اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ کہیں سے بھی عزتِ نفس اور وقارِ ذات خطرے میں نہ پڑنے پائے۔ وہ

خودی کے جوہر کو ختم نہیں ہونے دینا چاہتے۔انہیں یہ گوارہ نہیں کہ استحصال ہو۔محنت کسی کی ہو،صلہ کسی اور کو ملے:

علاج تشنہ لبی سہل تھا مگر ساقی
جو دست غیر میں تھا کب وہ جام لینا تھا

☆

تشنہ لب رہنے پہ بھی ساکھ تو تھی شان تو تھی
وضع رندانہ گئی اک طلب جام کے ساتھ

جو فقیر بن کے پائے وہی ننگ میکدہ ہے
جسے خود پلائے ساقی وہی رند برگزیدہ

☆

راہیں نئی نکالتے ہیں مثل کوہ کن
کرتے نہیں مصالحتیں فکر وفن میں ہم

علی جواد زیدیؔ نے ترقی پسندی سے جدیدیت تک کا سفر غیر محسوس طریقے پر طے کیا ہے اور فرد کی تنہائی ، معدومیت کا کرب ، نابرابری، مایوسی، محرومی اور ناآسودگی جیسے موضوعات پر بعض اچھے شعر کہے ہیں:

پڑھو تو رک کے یہ دیوار کی بھی تحریریں
تمہاری فتنہ گری کے ہزار محرم ہیں

☆

تہہ بہ تہہ راز ہے کتاب حیات ہر ورق کو پلٹ رہا ہوں میں

انہوں نے موت کو کتنے قریب سے دیکھا
جو لوگ مرحلۂ انتظار سے گزرے

☆

وہی ہوا وہی قطرہ وہی سمندر ہے
جو سر اٹھا کے چلا تھا وہ بلبلا نہ رہا

☆

جہاں بہا تھا لہو حرف حق سنانے پر
اسی گلی میں کوئی آج آشنا نہ رہا

☆

خلائے فکر کا احساس عرض فن سے ملا
برہنگی میں نیا لطف پیرہن سے ملا

زیدیؔ کے متذکرہ بالا اشعار کے مطالعے کے بعد خود ہی احساس ہوتا ہے کہ شاعر فکر اور اسلوب دونوں سطح پر جدید عناصر کو اپنانے کی لاشعوری کوشش میں مصروف ہے۔ شعری لہجہ، آہنگ اور لفظیات کی تراکیب اس بات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ شاعر کو نئی شعری بوطیقا تیار کرنے میں دلچسپی ہے اور وہ اس عمل میں مصروف بھی ہے:

سیل و طوفاں ہو تو کچھ صبر بھی آ جاتا ہے
گھر کو بے وجہ اجڑتے کوئی کیونکر دیکھے

☆

اس شہر نگاراں میں افتاد پڑی کیسی محسوس یہ ہوتا ہے ہم دشت میں آ نکلے

کھول دو دریچوں کو آندھیوں کو آنے دو
تنگ و تار زنداں میں گھٹ رہا ہے دم تنہا

☆

گفتگو کے شہزادے اس کھنڈر سے باہر چل
منتظر ہے خلوت میں وقت کی دلہن تنہا

☆

کچھ اس طرح کی بھی تنہائیوں سے گزرا ہوں
خدا نخواستہ جیسے مرا خدا نہ رہا

☆

ایک صحرا پہ نقش پا ہوں میں
آپ سے آپ مٹ رہا ہوں میں

☆

زندگی وہ ملی برتنے کو جیسے اعمال کی سزا ہوں میں

☆

وفا گناہ نہیں تھی مگر یہ دنیا ہے
یہاں گنا گیا ہم کو گنا ہگاروں میں

☆

ہیں مزاج حسن میں بھی وہی طور عاشقی کے
کبھی رنگ رخ پریدہ کبھی پیرہن دریدہ

تارے سے جھلملاتے ہیں مژگان یار پر
شاید نگاہ یاس بھی کچھ کام کر گئی

☆

گدگداتی ہوئی چلتی ہے جوانی کی نسیم
عارض حسن پہ اک شعلۂ غماز آیا

☆

یاد یوں آئی لیے رنگ وتمنا کا جلوس
جیسے اک قافلۂ ہمدم و دمساز آیا

☆

رات محفل میں ترے حسن سماعت کے طفیل
ایک شعلہ سا پس پردۂ آواز آیا

☆

خلقت ابل پڑی تھی تماشے کو زیردار
دشمن کو کیا کہوں وہی با چشم نم ملا

مختصر یہ کہ علی جواد زیدیؔ کی شاعری میں کلاسیکیت سے لے کر جدیدیت تک کے عناصر اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ان کی شاعری کلاسیکیت ،ترقی پسندی اور جدیدیت کا حسین سنگم ہے۔کلاسیکی شاعری کے مطالعے ،ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور ترقی پسندی کے بحران سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔زیدیؔ نے زندگی کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی توازن اور اعتدال برقرار رکھنے کی کوشش کی

ہے۔ان کے یہاں فکر وفن دونوں سطح پر ارتقاء کا عمل جاری وساری تھا:

یہ تپ کر نکھرتی ہوئی فکر نو

بھڑکتا ہوا شعلہ کام آ گیا

علی جواد زیدیؔ تھک ہار کر بیٹھنے والوں میں نہیں تھے۔عمل اور مسلسل عمل سے ان کی زندگی عبارت تھی اور یہی وہ عمل کا جذبہ تھا جو ان کی شاعری میں کارفرما نظر آتا ہے اور ایک کے بعد ایک نئے تجربے کے لئے ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا اور خوب سے خوب تر کی جستجو انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ان کی شاعری 'نسیم دشت آرزو' کے بعد فکر وفن کی سطح پر مختلف ارتقائی منازل سے گزر رہی تھی اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب محسوس ہوتے ہیں:

مسکراتے ہوئے الفاظ کی تہہ تک جاؤ

میرے اشعار میں ہے شورش ایام کی بات

حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں شورش ایام، غم جاناں، غم ذات سبھی کچھ موجود ہے اور یہ ساری چیزیں ان کے مطالعے، مشاہدے اور تجربات پر مبنی ہیں۔

'علی جواد زیدیؔ کو ادبی تنقید پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے ایک ادیب، ناقد اور شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔' (پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ)

'زیدیؔ کی شاعری روایت سے بہرہ مند اور تجربہ کی رنگینی سے بھرپور ہے'۔
(پروفیسر محمد حسن)

ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں ایک تعمیر پسند ادبی نقطۂ نظر دینے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ خود ہمیشہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن آزادی کے بعد ان کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ ادب کو قومی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے۔

(پروفیسر شارب ردولوی)

علی جواد زیدیؔ کی نظم گوئی

(۱)

ترقی پسند تحریک کا آغاز ایسے دور میں ہوا جب ملک کے عوام غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس وقت ہندوستانیوں کو سب سے اہم ضرورت آپسی اتحاد کی تھی اور انگریزی سامراج اس اتحاد کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس وقت ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ضرورت تھی جو ہندوستانی عوام کو ایک رکھ سکیں۔ اس ضرورت کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور اس تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے مختلف قسم کی ہنگامی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ ان ہنگامی نظموں کے موضوعات مختلف النوع تھے۔ یہ موضوعات کچھ تو اندرونی تھے اور کچھ بیرونی۔ اندرونی موضوعات میں قومی لیڈروں کی شخصیتیں اور ان کے کارنامے، آزادی، غلامی، ہندو مسلم اتحاد، بھوک، افلاس، قحط، کارخانوں اور ملوں کے مزدوروں وغیرہ کے مسائل تھے۔ جہاں تک بیرونی موضوعات کا تعلق ہے ان میں کارل مارکس، لینن، لال جھنڈا، کمیونسٹ تحریک، اشتراکیت، روسی انقلاب وغیرہ شامل تھے۔ چند برسوں میں ان اندرونی اور بیرونی موضوعات پر اس قدر تیزی سے نظمیں لکھی گئیں کہ ان کا ایک دفتر تیار ہو گیا۔ ان

نظموں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام کی تمام نظمیں دیکھا دیکھی اور فیشن کے طور پر کہی گئیں اور ان کے ذریعہ کمیونزم کا پرچار بھی دل کھول کر کیا گیا۔ ایسی نظموں میں فنی محاسن کم اور نعرہ بازی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں تخئیلی کس بل سے الگ بنے بنائے سانچے میں ڈھال کر نکالی گئیں۔ آگ، بجلی، خون، آندھی، طوفان، کل، کارخانہ، مزدور اور گولہ بارود جیسے گھن گرج والے الفاظ کی نمائندگی ایسی نظموں میں زیادہ کی گئی ہے لیکن اس سے قطع نظر اس عہد میں ایسی تخلیقات بھی پیش کی گئیں جن میں ایک رسیلا پن اور نرم و مانوس انداز بھی تھا اور ترقی پسندی کے مخصوص انداز بیان سے ہٹ کر فن کو فن کی حیثیت سے برتا گیا اور شعری محاسن سے پہلو تہی نہیں کی گئی۔ علی جواد زیدیؔ ان شعراء میں سے ایک ہیں جو مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی تصنیف 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' میں زیدیؔ کی نظم گوئی سے متعلق لکھا ہے:

> ''اپنے ابتدائی رومانوی دور سے نکلنے کے بعد علی جواد زیدیؔ نے زندگی کے بعض دوسرے مسائل پر پختہ انداز میں چیزیں لکھیں۔ علی جواد زیدیؔ نے اردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس کے ساتھ ہندی ادب سے ان کو بہت لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ابتدا ہی سے ایک رسیلا پن اور نرم و مانوس انداز ہے۔ ان کی انقلابی نظموں میں گھن گرج کے بجائے گیتوں کا بہاؤ اور گھلاوٹ ہے۔''

آزادی سے قبل زیدیؔ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں شعریت کم اور مشق سخن زیادہ ہے۔ وہ سیاسی موضوعات پر بھی لکھتے

ہیں مگر وہ موضوعات محض اخبار کی سرخیاں نہیں بلکہ ان میں زندگی کے تجربات بھی شامل ہیں۔علی جواد زیدیؔ نے اپنے مجموعہ 'تیشۂ آواز' کے مقدمے میں لکھا:

''میری نظموں کے محرک میرے ذاتی مشاہدات ومحسوسات و مطالعات ہیں ۔زبان و بیان کا خیال تو سبھی رکھتے ہیں لیکن مجھے فکری عنصر بھی عزیز ہے۔''

یہاں پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ علی جواد زیدیؔ طالب علموں کی سیاست میں پیش پیش تھے۔زیدیؔ نے خود اس کا ذکر اپنے مجموعہ 'نظم رگ سنگ' میں کیا ہے:

''میرے محبوب ترین مشغلے دو ہی تھے،ادب اور سیاست۔''

علی جواد زیدیؔ بائیں بازو کے افکار سے متاثر ہو کر سیاست میں داخل ہوئے تھے اور طلبا کی تحریک ہی سے زیدیؔ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اس لئے ان کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔(۱) ہنگامی نظمیں (۲) آزادی کے بعد کی نظمیں ۔ذیل میں علی جواد زیدیؔ کی چند ہنگامی نظموں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔آزادی کے بعد کی نظموں پر آئندہ صفحات میں اظہار خیال کیا جائے گا۔

علی جواد زیدیؔ طالب علموں کی سیاست کو ہندوستانی بیداری اور آزادی کی عام تحریک سے الگ نہیں سمجھتے۔وہ طالب علموں کی سیاست کو جوانی کا ابال نہیں بلکہ زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو ہر شعبۂ حیات اسی سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔وہ ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن ان کی یہ وابستگی تقلیدی نہیں تھی۔یعنی وہ ترقی پسند تحریک کی ہر بات اور ہر موڑ پر ساتھ دینے کے بجائے تنقید ہی کرتے ہیں۔ان کے یہاں رومان و انقلاب اور طرز قدیم کی آمیزش نے بھی ان کی شاعری میں اپنا

رنگ جمایا ہے۔ ان کی ایک نظم 'منزلیں' ہے جس کا انداز بیان بڑا دلکش ہے۔ زیدی نے اس نظم میں ہندوستانیوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ظاہری دلکشی ورعنائی دیکھ کر کہیں قدم ڈگمگا نہ جائیں اور دار ورسن کی صعوبتیں تمہارے عزم واستقلال کو متزلزل نہ کردیں:

مسافر راستے میں رک نہ جانا
ہزاروں منزلیں ایسی ملیں گی
جہاں ہر گام پر کلیاں کھلیں گی
جہاں دکھلا کے دل آویز راہیں
تجھے بہکائیں گی تیری نگاہیں
مگر تو ان کے دھوکے میں نہ آنا
مسافر راستے میں رک نہ جانا
ملیں گے تجھ کو کچھ ایسے محل بھی
جہاں جلتے ہیں عشرت کے کنول بھی
جہاں شیشوں سے بہتی آگ بھی ہے
جہاں للچانے والا راگ بھی ہے
نہ بن جانا کہیں ان کا نشانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

علی جواد زیدیؔ کی ایک نظم 'تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟' ایک مدت تک بہت مقبول رہی۔ یہاں عورت کا روایتی اور ترقی پسند تصور ایک دوسرے سے برسر

پیکار محسوس ہوتا ہے۔ان کے خیال کے مطابق اس نظم میں محبوب پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نرم و نازک ہے اس لئے وہ آلام و مصائب برداشت نہیں کر سکتی۔محبوب ان سنگین مسائل کو سمجھ نہیں سکتی اور نہ اس کی معصومیت اور نرمی اس کی تاب لا سکتی ہے اور جب محبوبہ یہ کہتی ہے کہ وہ بھی اس جنگ میں اس کے ساتھ چلے گی تو اسے یقین نہیں آتا کہ وہ اس طوفان کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے۔اس نظم کا درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں:

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

تم حسن و نزاکت کی دنیا تم اس دنیا کو کیا جانو
یہ راہ کٹھن یہ کوس کڑے کچھ سوچ تو لو کچھ پہچانو
اس راہ خطر سے لوٹ چلو گھر جاؤ مرا کہنا مانو
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

علی جواد زیدیؔ کا محبوب ایک وفادار اور معصوم صفت محبوب ہے۔ وہ ایک ہندوستانی سماج کی پروردہ لڑکی ہے۔ باوجود اس کے کہ علی جواد زیدیؔ ایک انقلابی شاعر ہیں لیکن اپنے مخصوص لہجے میں بڑے نرم انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک نظم 'تم پوچھ رہی ہو کیا ہوگا؟' میں شاعر نے محبوب کو جوابات دینے کی کافی حد تک کوشش کی ہے:

تم پوچھ رہی ہو کیا ہوگا؟ کیا ہوگا دل کی امنگوں کا؟
خود ہم نے جن کو چھیڑا ہے کیا ہوگا ایسی جنگوں کا؟
اب کون نشاں لہرائے گا دنیا میں بھوکوں ننگوں کا؟
تم پوچھ رہی ہو کیا ہوگا؟

زیدیؔ کی ابتدائی دور کی بیشتر نظموں میں (جو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک محیط ہیں) تاریخ آزادی کے بیحد حساس لمحوں کی ترجمانی موجود ہے۔ دراصل یہ متوسط طبقہ کے ان تمام نوجوانوں کی جذباتی سرگزشت تھی جو جاگیردارانہ گھرانوں سے نکل کر تعلیم اور ادب کے راستے سے اشتراکی تحریکوں میں آئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اسے وہ زندگی کا مقصد مان لیتے ہیں اور اسی سے ہر شعبۂ حیات کو وابستہ سمجھتے ہیں۔ علی جواد زیدیؔ کی ایک نظم 'ہم جماعت خاتون' کی پہلی گفتگو کا یہ اثر ہوا:

ایک دن خود بڑھ کے تو نے یہ خموشی توڑ دی
ذہن میں اٹھتے ہوئے طوفان کی رو موڑ دی
خامشی سے کھولتے پانی کے چشمے جم گئے
چل رہے تھے دل میں جو بجلی کے پنکھے تھم گئے
چبھ گئے تھے جتنے کانٹے زندگی کے پاؤں میں
بیٹھ کر ہم نے نکالے گفتگو کی چھاؤں میں

اور جس کی گفتگو کا یہ اثر ہو اس سے شاعر کیا چاہتا ہے:

اٹھ بدل دے صورت تعمیر میں تخریب کو
ایک دیوی کی ضرورت ہے نئی تہذیب کو

اور جب شاعر کے نظریات کو اختیار کرنے میں معشوق انکار کر دیتا ہے تو شاعر کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے:

جب سیاست میں حریفانہ مجھے آنا پڑا
غیر سے ٹکر ہوئی تجھ سے بھی ٹکرانا پڑا

فیصلہ کرنا ہے لیکن تھرتھرا جاتا ہوں میں
دور ہٹتا ہوں کبھی نزدیک آجاتا ہوں میں
گاہ تیرے ذکر سے لذت بھی پاجاتا ہوں میں
لیکن اپنی وسعتوں میں گم ہوا جاتا ہوں میں
وحشت فرہاد کا میں دم کبھی بھرتا نہیں
میں محبت کو سیاست سے جدا کرتا نہیں

شاعر نے اپنے دل و دماغ کو ان منزلوں تک کس طرح پہنچایا ہوگا اس کی تفسیر تو زیدیؔ ہی کر سکتے ہیں لیکن ان کی شاعری زندگی سے اتنی قریب ہے کہ ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے۔ زیدیؔ نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے ساتھ ساتھ عمل کی نئی دنیا تعمیر کرنے کے لئے جس آمادگی اور جس تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے اسے 'کایا پلٹ' میں ملاحظہ فرمائیں:

وہ بھوک اور پیاس کے لمحے گذر گئے
جب دل کو فکر تھی طلب مدعا کرے
خودداریاں جو روک رہی تھیں سوال سے
دل میں دعائیں کرتے تھے اکثر خدا کرے
اب بے سوال دل کے ارادے ہی اور ہیں
تدبیر اس کو جلد عمل آشنا کرے
سر پر عمل کا تاج ہے تاجوں کا بادشاہ
ہمت کسی میں ہو تو ذرا سا منا کرے

علی جواد زیدیؔ سماج میں پھیلے ظلم و جور، نا انصافی و نابرابری جیسے عناصر کو پوری طرح محسوس کر لیتے ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے عناصر کو بھی تلاش کرتے ہیں جن کے رشتے سماج کے بڑے بڑے مسائل سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی نظم 'چند مناظر' میں ان کیفیات کی پوری نمائندگی ہوتی ہے جس کا عالمانہ ادراک کر لینے کے بعد عمل کی منزل ہے۔ ان مناظر میں زندگی، ٹوٹے جھونپڑے، تڑپتے بچے، قسمت کے جھوٹے قصے، مزدوروں کے زرد چہرے، اندھیری رات، شکستہ دل، بھکارن، خون کا پیاسا بھائی، شکاری ملا، جنگ کی طرف جاتی ہوئی دنیا، سر بیچنے والا مرد مفلس، بے بس تہذیب، میدان جنگ کا بینڈ اور بیوہ کی فغاں سب کچھ پیش کر رہی ہے۔ زیدیؔ نے اس نظم میں بندھے ٹکے موضوع کو نہیں اپنایا ہے بلکہ متنوع مناظر کو سمیٹ دیا ہے اور اس الزام کو باطل کر دیا کہ ترقی پسند شاعروں کے یہاں متنوع اور وسیع موضوعات نہیں ہیں۔ یہ نظم زیدیؔ کی شاہکار نظم ہے اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

میدان میں بینڈ بج رہا ہے
بیوہ کی فغاں سے درد لے کر
اور موت ترانے گا رہی ہے
انسان کی آہ سرد لے کر
دنیا سے وہ چل بسے سپاہی
افلاس کا روئے زرد لیکر
اور میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں

اس نظم میں 'اور میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں' کی بار بار تکرار اس جذبے کے

لئے ملامت کے پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے جو صرف سوچنے کو کافی سمجھ لیتا ہے اور یہ تکرار مادی حالات کی روشنی میں، یہ سوچنا بیکار نہیں ہوتا۔ جوانی ہمت کے سر پر تاج رکھ دیتی ہے اور نیا شعور بیدار ہوتا ہے۔ جذباتی طور سے یہ تاج پہن لینا تو خیال آرائی ہے لیکن راہ کی دشواریوں کا اندازہ لگا کر اس پر چلنا رومان پسندی نہیں ہے۔ جس کی نظر میں تنقیدی صلاحیت نہیں ہے اس کے لئے دونوں راستے ایک ہیں لیکن زیدیؔ دونوں کا فرق سمجھتے ہیں:

غلط راہیں دکھاتا ہے طبیعت کا ابال اب بھی
یہ کاذب صبح راتوں کو بنا کرتی ہے جال اب بھی

علی جواد زیدیؔ ان منزلوں کا پتہ لگانا چاہتے ہیں جو اس راہ کے ہر مسافر کے سامنے آئیں گی۔ اپنی نظم 'منزلیں' میں انہیں منزلوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

تری منزل ہے آزادی کی منزل
تمناؤں کی آزادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہے
غلامی کی سلاخیں توڑنا ہے
وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا
مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے
تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا نہ ہرگز ہچکچانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

علی جواد زیدیؔ کا خیال ہے کہ آزادی ہی ہر ہندوستانی کی منزل ہے اور آزادی کے بغیر زندگی کی لطافتیں اور سکون نہیں حاصل ہو سکتے اور بغیر قربانی کے آزادی ناممکن ہے اسلئے کہ دستور زمانہ کے مطابق آج تکلیف ہے کل آرام ہے، آج موت ہے کل زندگی ہے۔ یہ صرف نعرہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ادراک وعمل کا بے پایاں طوفان ہے۔ یقین اور امید ہے اور وہی فنکار ترقی کی راہ پر گامزن ہے جو عمل کی راہیں دکھا کر ہمیں اپنی منزل تک پہنچا دے۔

اگست ۱۹۴۲ء کا خونی انقلاب ہماری تاریخ آزادی کا اہم موڑ ہے۔ اس موقع پر ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے مختلف نظریات تھے۔ بہرحال جنگ نے ہر صاحب فکر ونظر کو سمجھنے، سوچنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے کا بہترین موقع دیا اور ہر صاحب نظر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جنگ ختم ہونا چاہئے ورنہ کروڑوں انسانوں کا خون رائیگاں جائیگا۔ اس بات کو سمجھ لیا گیا کہ اگر جنگ ہی کو ہم نے قوموں کی آزادی، انسانیت کی ترقی اور معاشی نابرابری سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تو پھر ایک اور جنگ کا انتظار کرنا پڑیگا۔ عوام کی طاقتوں کو شکست مان لینا پڑیگا۔ ترقی کا گلا گھونٹ دینا پڑیگا اور صرف یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں مل سکتا کہ یہ جنگ ہماری نہیں ہے۔ علی جواد زیدیؔ جنگ کے حامی نہیں ہیں پھر بھی ان کا خیال ہے کہ اگر جنگ ہمارے اوپر ٹوٹ پڑتی ہے تو ہمیں لڑنا ہی ہے:

یہ جنگ ہماری کب ہے یہ جنگ کسی کی کب ہے
پھر بھی ہم کو لڑنا ہے پھر بھی ہم سے مطلب ہے

علی جواد زیدیؔ کا خیال ہے کہ یہ جنگ تمام انسانوں کی جنگ ہے۔ ان تمام

لوگوں کی جنگ ہے جو ایک روشن مستقبل کے خواہاں ہیں۔ وہ سرمایہ داری کے تضاد، شہنشاہیت کے زوال اور فرسودہ نظام کے کھوکھلے پن کا ضرور ذکر کرتے ہیں اور ان کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ ناامید نہیں ہے بلکہ انہیں اس نظام سے چھٹکارا ملنے کا یقین بھی ہے:

وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا
مگر ہونے ہی والا ہے سویرا

علی جواد زیدیؔ قوموں کی آزادی کو نزدیک سے دیکھنے کے خواہشمند ہیں اور اس میں وہ عملی طور سے شریک ہیں۔ وہ روس کی مدافعت کے معرف اور فاشزم کی مکمل تباہی کے خواہاں ہیں۔ اس خواہش میں وہ تمام ترقی پسندوں کے ہم نوا ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری کا قلعہ جب تک مسمار نہ ہوگا دنیا آزادی نہیں حاصل کر سکتی۔ اسی عملی زندگی کی وجہ سے انہوں نے جیل جانا گوارا کیا۔ زندان کی چہار دیواری نے انہیں شکستہ پا نہیں بنایا بلکہ ان کے عمل کے جذبے کو اور مہمیز کیا۔ اپنے سیاسی رفیق علی سردار جعفریؔ کی نظر بندی کی خبر سن کر وہ تلملا جاتے ہیں۔ اور باوجود اصولی اختلاف کے انہوں نے ایک پرخلوص نظم کہی اس کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

گھر تو گھر تھا ہم نے پروائے حکومت بھی نہ کی
ہم تھے وہ محشر بدل فکر قیامت بھی نہ کی

علی جواد زیدیؔ رومان پسند اور خیال پرست نہیں ہیں لیکن ان کی طبیعت میں جدت کا پوشیدہ عنصر انہیں کبھی کبھی عارضی اور وقتی جذبات کی گود میں ڈال دیتا ہے اور ان کے یہاں رجائیت کا شدید جذبہ مایوسی میں بدل جاتا ہے۔ ان کی خواہشیں حقیقت پر غلبہ پالیتی ہیں۔ 'اختتام قید' میں ان کی اس رجائیت اور مایوسی کا پتہ چلتا ہے:

قریب ختم ہیں وہ دن بھی زندگانی کے
جو لطف صحبت یاراں سے آشنا نہ ہوئے
چھپا ہوا یہ کوئی شعلہ آبشار میں تھا
کہ نیش تشنہ لبی ذہن مے گسار میں تھا
بھٹک کے آئی نہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بھی
سنی گئی نہ شمیم طرب کی آہٹ بھی
وہ حوصلے جو اسیری میں بھی بلند رہے
غضب یہ تھا کہ گرفتار قید و بند رہے
نجات بندش پیہم سے پا نہیں سکتا
غلام رہ کے کوئی مسکرا نہیں سکتا

چونکہ غلام ملک کبھی مسکرا نہیں سکتا ہے اس لئے وہ یہ بھی کہتے ہیں:

کانٹوں سے بھری راہ پہ چلنا ہے تو کیا غم
مٹی کے نمو کے لئے جلنا ہے تو کیا غم
اس فکر میں کیوں لذت امکاں کو بھلا دیں
کیوں پھر سے نہ ہم محفل رندانہ سجا دیں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ترقی پسندوں نے فیشن کے طور پر بہت سی نظمیں کہیں اور زیادہ تر شعرا کے یہاں ایک موضوعات پر مختلف نظمیں ملیں گی اور جب اس قبیل کی نظمیں جن میں سیاق وسباق شاعری شخصیت کا جزو بننے لگتے ہیں تو زیدؔی کے یہاں 'دوراہے پر، منزلیں، جام بدست و جنازہ بدوش، گرفتاری کے بعد،

جیل کی ایک رات، آغاز شباب' اور 'ماں' جیسی نظمیں وجود پاتی ہیں جن میں سیاسی زندگی کی آپ بیتی موجود ہے۔ 'ماں' علی جواد زیدیؔ کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ ایک زمیندارانہ گھرانے کی ماں ہوتے ہوئے بھی ایک ہندوستانی ماں ہے اس لئے یہ ماں اپنے بیٹے سے محبت کرتے ہوئے بھی اسے اپنے وطن پر قربان کر دیتی ہے اور بیٹا بھی اپنی دھرتی ماں پر اپنی ماں کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ نظم زیدیؔ نے اپنی ماں کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ کیونکہ کچھ قدامت پسند اعزاء زیدیؔ کی گرفتاری کو اپنے لئے باعث ننگ وعار سمجھتے تھے۔ اس نظم کے چند شعر بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

پائندہ باد رسم و رہ مہر مادری
تجھ سے جہاں میں روح خوشی کو دوام ہے
میرے عزیز لاکھ برائی کریں مری
تو دل میں خوش کہ تیرا پسر نیک نام ہے
مجھ کو بھی قید و بند سے الفت نہیں مگر
ظلم وستم کی مجھ پہ اطاعت حرام ہے
تو جانتی ہے قلب حقیقت شناس کو
تو واقف فسانۂ زندان شام ہے
شاید تجھے بھی ہجر پسر یہ بتا سکے
زندان و دار ہند میں اک رسم عام ہے
جس نامراد ملک میں کی پرورش مری
صدیوں سے وہ اسیر وفقیر وغلام ہے

اس نظم میں علی جواد زیدیؔ نے اپنے پورے عقیدے کی وضاحت کردی ہے۔ وہ اس غلام ملک میں قید رہنا رہائی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اپنے سیاسی رفیق قاضی جلیل عباسی کی رہائی پر اپنے عقیدے کی مزید وضاحت کرتے ہیں:

رہائی لفظ بے معنی ہے دنیائے غلامی میں
یہاں افراد کیا خود ملک ہے قید دوامی میں
ہر اک گوشے پہ قید و بند کے قانون حاوی ہیں
یہاں نوعیتیں آزاد و قیدی کی مساوی ہیں
ہمارا ملک اک زندان بے دیوار ہے ہمدم
یہاں ہر اک قدم پر امتحان دار ہے ہمدم

علی جواد زیدیؔ چونکہ غلام ہندوستان کو 'زندان بے دیوار' سمجھتے ہیں اس لئے ان کا مقصد حیات اس زندان سے تمام ہندوستانیوں کی رہائی ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہے بلکہ علی جواد زیدیؔ نے اس قربانی کو عملی طور پر پیش بھی کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ زیدیؔ ایک زمیندار گھرانے کی فرد تھے اور ان کا رشتہ بھی ایک عزیز کے یہاں طے ہو چکا تھا لیکن جدو جہد آزادی میں گرفتاری کی وجہ سے زیدیؔ کا وہ رشتہ ٹوٹ گیا اور اس لڑکی کی شادی کسی اور جگہ ہوگئی لیکن زیدیؔ اس قربانی سے رنجیدہ نہیں ہوئے بلکہ خوش ہوئے جیسے کوئی بڑا بوجھ سر سے اتر گیا۔ اس پس منظر میں وہ اپنی نظم 'میری راہ میں' بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں جس میں محبوبہ جنگ میں ساتھ چلنے پر اصرار کرتی ہے تو انہیں یقین نہیں ہوتا کہ وہ اس طوفان کا مقابلہ کیسے کر پائے گی۔ زیدیؔ ایک انقلابی شاعر

ہونے کے باوجود بڑے نرم و نازک لہجے میں اسے اپنی ذمہ داریاں بتاتے ہیں اور بقول خلیل الرحمٰن اعظمی 'اس میں عورت کا روایتی اور ترقی پسندانہ رنگ ایک دوسرے سے دست وگریباں معلوم ہوتے ہیں'۔ان کی یہ نظم ترقی پسند حلقوں میں ایک عرصے تک کافی مقبول رہی ہے جس کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

تم حسن و نزاکت کی دنیا تم اس دنیا کو کیا جانو
یہ راہ کٹھن یہ کوس کڑے کچھ سوچ تو لو کچھ پہچانو
اس راہ خطر سے لوٹ چلو گھر جاؤ مرا کہنا مانو

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

اس راہ میں پیاس جوانی کی، اک دن بھی نہیں بجھنے پاتی
اس راہ میں دل رہتے ہیں تپاں، اس راہ میں جلتی ہے چھاتی
اس راہ میں کٹھنائی کی پری سو روپ سے جلوے دکھلاتی

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

اس راہ میں واعظ آتا ہے، نیلے پیلے دیدے کر کے
یاں زہر ہلاہل ملتا ہے، صہبا کی صراحی میں بھر کے
مرتا ہے کوئی زندہ رہ کر، جیتا ہے کوئی یاں مر مر کے

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

میں مست شرابی میرا کیا، میں تو سب کچھ ٹھکرا دونگا
دنیا کے سارے گناہوں کا، اس دنیا سے بدلہ لوں گا

یہ موقع ہے بڑھ جانے کا، پھر جو ہوگا وہ دیکھوں گا

کیا تم سب یہ کر پاؤ گی؟

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

اس کے علاوہ 'آج بھی، وصیت، ہوا کے گیت، اہنسا کی لڑائی، پریم جگت، شیطانی سازش، اختتام قید، جیل کا اسپتال' وغیرہ ان کی سیاسی زندگی کی کامیاب نظمیں ہیں۔ اسکے بعد علی جواد زیدیؔ اپنی ذات سے کسی قدر دور اور سماج سے بہت حد تک قریب ہو جاتے ہیں۔ 'نعرۂ امن، معمار آزادی، ماسکو کے محافظ، مادر ہندوستان، روسی سپاہیوں کو پیغام' اور 'بہار پھر بھی بہار ہے' وغیرہ میں اس پہلو کو دیکھا جا سکتا ہے۔ 'بہار پھر بھی بہار ہے' کا ایک بند پیش کیا جا رہا ہے:

میں جانتا تھا قدم قدم پر بچھے ہیں راہوں میں خار اب بھی
ستا رہا ہے، رلا رہا ہے، وہی غم روزگار اب بھی
مگر یہ احساس کیوں ہے دل میں کہ دل رہا ہے بہار اب بھی

اس نظم میں زیدیؔ نے آزادی کی جدوجہد کو کس قدر رمزیت اور رنگینی سے بیان کیا ہے اس کا اندازہ تو صاحبان ذوق ہی کر سکتے ہیں لیکن اتنا تو بادی النظر میں ہے کہ اس رمزیت اور رنگینی کو علی جواد زیدیؔ نے بڑی آن بان سے طے کیا ہے۔ اس میں نمود و نمائش نہیں ہے۔ حالات کی سنگینی کو تخئیل کی رنگینی کی مدد سے بہت پر اثر کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم 'دور اہے' میں اسے اور رنگین بنا دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آزادی کے متوالوں کے دلوں میں جو تمنائیں پیدا ہو رہی تھیں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

فطرت سے بڑا کون ہے فطرت کا محافظ
فطرت پہ مگر لوگ بھروسہ نہیں کرتے
جس بزم میں پابند نہ ہوں حسن کے جلوے
اس بزم میں چھپ چھپ کے تماشا نہیں کرتے
کہنے کو بڑے پاک بڑے صاف ہیں لیکن
یہ اہل صفا کرنے کو کیا کیا نہیں کرتے

رک جانے کی اب کوئی بھی تدبیر نہیں ہے
اس چلتی ہوئی ریل میں زنجیر نہیں ہے

'کشمکش' میں علی جواد زیدیؔ نے طبقاتی کشمکش کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ان کی شاعری کے دورِ عروج کی کامیاب نظم ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

گودی کے مہ و سال میں مچلوں کہ نہ مچلوں؟
آتے ہوئے آلام کا ڈر روک رہا ہے
منزل کی طرف باگ کو موڑوں کہ نہ موڑوں؟
کوئی مری ہر راہ گزر روک رہا ہے
فرسودہ نظاموں کو بدل دوں کہ نہ بدلوں؟
تہذیب کا ہلتا ہوا سر روک رہا ہے
میں منکر اوہام ہوں بولوں کہ نہ بولوں
حامی تو ہے واعظ بھی مگر روک رہا ہے
رکنے کا بھی امکان ہے چلنے کا بھی امکان

جلنے کا بھی امکان ہے پھلنے کا بھی امکان
تھمنے کا بھی امکان ابلنے کا بھی امکان
گرنے کا بھی امکان سنبھلنے کا بھی امکان
طوفان سے کشتی کو نکالیں تو مزا ہے
ہستی کو تباہی سے بچالیں تو مزا ہے

علی جواد زیدیؔ کی درج بالا نظموں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نظموں میں گھن گرج کے بجائے مترنم لہجہ ہے۔ اردو میں آزاد نظم ترقی پسندی کی دین ہے جس کی زبردست مخالفت بھی کی گئی لیکن ترقی پسندوں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بہت سی کامیاب نظمیں لکھیں اور آج تو آزاد نظم کو حسن نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ علی جواد زیدیؔ نے بھی کئی آزاد نظمیں کہی ہیں ان میں سے 'کڑی دھوپ، دوست، دوستی، عجیب تنہائی، چمنی کا دھنواں، لاش' اور 'ہولی' ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ 'لاش' ان کی ایک اہم نظم ہے۔ فارسی اور اردو کے مشہور شاعر اقبال احمد سہیلؔ جو کہ آزاد نظم کے قائل نہ تھے اس نظم کو پڑھنے کے بعد کہنے لگے:

''اگر نئے شعرا ایسی آزاد نظمیں لکھیں تو مجھے آزاد نظم سے کوئی بیر نہیں۔''

(بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی)

یہ نظم مہادیو دیسائی کی موت پر لکھا گیا شخصی مرثیہ ہے اور زیدیؔ کی کامیاب نظموں میں سے ہے:

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ دور اپنے آشرم کو چھوڑ کر

یہ اپنے ٹوٹے جھونپڑے سے اپنے منھ کو موڑ کر
یہ ظلم و جور کی بھری کلائیاں مروڑ کر
نکل پڑا
اندھیری رات تھی مگر یہ چل پڑا
کوئی بھی ہو عزیز ہے
کہ اس جری نے جان دی ہے جشن رزمگاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

علی جواد زیدیؔ کی تخئیل نے ان کی بزم شعر کے ساغر و مینا سجائے ہیں۔ان کی شاعری میں کلاسیکی انداز اور عملی زندگی کا رنگ نمایاں ہے۔ان کی یہ خصوصیت تو عام ہے لیکن چھوٹی اور مترنم بحروں کی نظموں میں یہ انداز اور بھی دلنواز ہو جاتا ہے۔ان کی نظم 'مست جواں' جو کہ بہت مشہور ہوئی۔راقم السطور خود بھی اپنے بچپن میں اس نظم کو بڑی لے سے گایا کرتا تھا اور آج بھی یہ نظم اسکولی بچے جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔یہ نظم فنی اعتبار سے بہت بلند پایہ نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی کامیاب اور پسند کیوں کی گئی؟ اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے نغمگی اور موسیقیت کے ساتھ دریا کی سی روانی جو قاری کو اپنے مترنم لب ولہجہ کے ساتھ بہالے جاتی ہے۔اس نظم کا ایک بند بطور نمونہ حاضر خدمت کیا جا رہا ہے:

گولی کی زد پہ جم گئے سینوں کو تان کے
توپوں کے منھ پہ ڈٹ گئے انجام جان کے
کیا ویر تھے سپوت یہ ہندوستان کے
کیسے یہ مست لوگ تھے کیا نوجوان تھے

۱۹۴۲ء کا آندولن ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے جس میں ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس آندولن سے متاثر ہو کر ان کے رشحات قلم سے بہت سی نظمیں وجود میں آئیں۔ علی جواد زیدیؔ تو اس آندولن میں عملی طور سے شریک بھی تھے اور اس سلسلے میں اعظم گڑھ میں ان کے مکان پر چھاپہ بھی پڑا۔ قیام اعظم گڑھ ہی میں زیدیؔ اور شمیمؔ کرہانی نے اس موضوع پر بہت سے کامیاب نظمیں لکھیں۔ ان میں زیدیؔ کی دو نظمیں 'دھارے کا موڑ' اور 'ہولی' بہت مشہور ہوئیں۔

'دھارے کا موڑ' دراصل ایک گیت ہے جسکے درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں:

دھارے کی کمر لچک چکی ہے
تہہ خانوں میں فوج چل رہی ہے
طوفان کی ہوس مچل رہی ہے
پانی کی نظر بہک چکی ہے
دھارے کے موڑ سے خبردار!

کھیتوں کی زمین دھنس رہی ہے
بدمست پڑے ہیں راجہ رانی
گومحلوں کی نیو ہے پرانی
بےفکری پہ موت ہنس رہی ہے
دھارے کے موڑ سے خبردار!

لہروں نے سنبھال لیں کدالیں
آغاز ہوئی ہے نئی کہانی

شاید ہی بچے یہ راجدھانی
بیکار ہیں پتھروں کی ڈھالیں
دھارے کے موڑ سے خبردار!

زیدیؔ کی دوسری کامیاب نظم 'ہولی' ہے جسے کرشن چندر کی مرتب کردہ کتاب 'نئے زاویے' اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی مرتبہ کتاب 'نئی نظم کا سفر' کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو ہند کے انتخاب 'سلسلہ' میں منتخب کیا ہے اور غالباً زیدیؔ کے دور عروج کی سب سے کامیاب نظم ہے۔ 'ہولی' میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے مختلف منازل کی علامتی انداز میں بڑی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ زیدیؔ نے اس نظم میں حالات کی سنگینی کو تخیل کی مدد سے بہت ہی اثر انگیز بنادیا ہے اور 'ہولی' کو ایک زندہ علامت بنا کر آزادی کی جدوجہد بالخصوص 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کو بڑی رنگینی اور رمزیت کے ساتھ بیان کیا ہے:

منھ میکدے سے موڑ کر ہولی کی یہ ٹولی چلی
گلزار میں
سبزے، لچکتی ڈالیاں، گنجان، سندر جھاڑیاں
پانی کی سینچی کیاریاں، کانٹوں میں چھپتی پتیاں
یہ سب سہی لیکن یہاں وہ شے کہاں
جس کے لئے مشہور ہے انگور ناب
ہاں کیا کہا، پیر مغاں
تلووں کے نیچے پھول ہیں ان میں سے دو اک چن بھی لوں

خالی ہیں گلدستے ترے
تجھ کو نہیں معلوم ابھی
خالی یہ گلدستے ترے خالی ہی رہ جائیں گے اب
پھولوں نے ٹھانی ہے کہ شاخوں ہی پہ مرجائیں گے اب

☆

اور تیرے کمروں میں نہ وہ آئیں گے اب
منھ بند کلیاں اب کہاں؟
جو اپنی سندر موہنی مسکان کر دیں رائیگاں
اور اپنا گلشن چھوڑ دیں سینے میں خوشبوئیں لئے
اور اجنبی ماحول میں
طاق نظر کی کانپتی زینت بنیں
کلیوں کے منھ اب کھل چکے، منھ بند کلیاں اب کہاں
کلیاں کہاں، یہ پھول ہیں
خاک چمن کی گود میں آرام جاں یہ پھول ہیں
آتش زباں یہ پھول ہیں
اور دیکھ تو یہ پھول کتنے شوخ ہیں
جو ٹوٹ کر شاخوں سے گر جاتے ہیں تیری راہ میں
اے دل شکن پیر مغاں
آ دیکھ ان کی ہمتیں

یہ چاہتے ہیں روک دیں گلزار میں راہیں تری
تیرے لئے چارہ ہی کیا اب رہ گیا
ان بے حیا پھولوں کی آنکھوں کا تو پانی بہہ گیا
اب یہ ہیں تیری جرأتیں روکیں گے تیرے راستے
تو بھی خدا کے واسطے
ان کو کچل دے پیس دے
ورنہ خدانا خواستہ
یہ روک ہی لیں راستہ
کلیاں نہیں کانٹے ہیں یہ
کانٹوں سے بھی بدتر ہیں یہ، نشتر ہیں یہ، خنجر ہیں یہ
گلزار میں تیرے قدم کچھ آج تو آئے نہیں
تو نے انہیں سبزوں پہ کی ہے میکشی
صدیوں سے تیرا دور ہے
گلزار پر حق ہے ترا
یہ کون ہے جو روک دے، گلزار میں راہیں تری

اور نظم کا آخری بند آزادی کے متوالوں کے جذبات واحساسات کی بہترین عکاسی کرتا نظر آتا ہے:

تو ڈر گیا پیر مغاں
کتنا بھیانک خواب تھا

تعبیر کچھ بھی ہو مگر
تیرے وفاداروں نے کل
کس آن سے، کس بان سے، کس شان سے
کھیلیں گلابی ہولیاں

علی جواد زیدیؔ نے شاخ، پھول، سبزے، گلدستوں، ڈالیاں، جھاڑیاں وغیرہ کے اس پیرائے میں جدوجہد آزادی کے ایک ایک موڑ کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

'نیا سال' اور 'کشمیر' بظاہر بیانیہ نظم ہے لیکن زیدیؔ نے اس میں بھی ندرت فکر اور جدت ادا کے پہلو نکال لئے ہیں۔ 'کشمیر' میں شاعر نے تاریخی واقعات اور اپنے قلبی احساسات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں۔ 'کشمیر' کے دو بند بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

راستوں میں یہ پراگندہ کسانوں کے ہجوم
جو تمناؤں کے موہوم خنک سائے میں
سوچتے جاتے تھے الجھے ہوئے پیرائے میں
اپنا حصہ نہیں کشمیر کے سرمائے میں
ان کے چہروں پہ فقط جلوۂ حسن مظلوم
میں نے دیکھے ہیں وہ آنسو جو چھلکتے ہی نہیں
میں نے دیکھا ہے تبسم میں لپیٹا ہوا درد
میں نے دیکھے ہیں وہ لمحات خوشی جن کی مثال
ایسی ہے جیسے نئی راہ میں اک راہ نورد

کیسے میں ان کے سوا اور کوئی ذکر کروں؟
کیسے کشمیر کو میں جنت ارضی کہہ دوں؟

اس نظم کا آخری بند صرف نظم ہی نہیں بلکہ علی جواد زیدیؔ کے شاعرانہ مزاج پر بھی روشنی ڈالتا ہے:

میرے کشمیر نہ ہو مجھ سے خفا شاعر ہوں
شوخ سورج کی کڑی آگ کا سہنے والا
تپتے جلتے ہوئے میدانوں کا رہنے والا
اور اس آگ کو اک گلکدہ کہنے والا
تجھ کو فردوس سمجھ لینے پہ بھی قادر ہوں
گر یہی تیری تمنا ہے تو میں حاضر ہوں!

علی جواد زیدیؔ ترقی پسندوں کے ساتھ نئی منزل کی تلاش میں ہیں اور انہیں یقین ہے کہ وہ دور ضرور آئے گا اور اس نئے دور کا آغاز ضرور ہوگا اس لئے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں ہمت نہیں ہارنا چاہئے اور عزم و عمل اور حوصلہ کو بروئے کار لا کر اس نئے دور کا آغاز کرنا ہے:

افق شام پہ تارا جو یہ تھراتا ہے
اک نئے دور کا آغاز نظر آتا ہے
اپنی منزل کی طرف وقت کھنچا آتا ہے

☆

جب بھی آغاز ہوا یونہی ہوا ہے یارو

ٹھوکریں کھا کے اٹھو ساتھیوں کو للکارو
کوئی ساتھی نہ ملے تب بھی نہ ہمت ہارو

☆

دور ہے منزل مقصود مگر ہے تو سہی
رہروؤں کا کوئی معیار نظر ہے تو سہی
جرأت وعزم بہ انداز سفر ہے تو سہی

اپنی ایک دوسری نظم 'درمیانی منزل' میں یہ کہتے ہیں کہ ابھی تو سفر کی ابتدا بھی نہیں ہے۔ اس سفر کی جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا۔ اس سفر میں منزل کے لئے ہمیں بہت سی پریشانیاں اٹھانی ہیں اور راستہ تلاش کرنا ہے:

مگر ابھی تو سفر کی یہ ابتداء بھی نہیں
ابھی تو شہر کی سرحد کے پار نکلے ہیں
ابھی فصیل سے کچھ دور کارواں والے
پئے نظارۂ لیل و نہار نکلے ہیں

اور اسی نظم میں زیدیؔ کہتے ہیں کہ ابھی تو مکمل آزادی ہمیں ملی بھی نہیں اور ہم ابھی سے چاہتے ہیں کہ آرام وسکون سے رہیں۔ ابھی سے ہمیں آرام کی خواہش نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ مکمل آزادی اسی وقت ملے گی جب ہم اپنے آپ کو آزاد محسوس کریں:

ابھی تو منزل اول ہے اے رفیق سفر
ابھی سے خواہش آرام فکر عصیاں ہے

ہمارا قافلہ اس منزل گریز اں میں
بس ایک شب کا فقط ایک شب کا مہماں ہے

یہی وجہ ہے کہ علی جواد زیدیؔ آزادی کے بعد بھی ہمت نہیں ہارتے بلکہ اس نازک دور میں بھی تعمیری نظریہ پیش کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ آزادی سے پہلے ہمارا مقصد وطن کو آزاد کرانا تھا اور آزادی کے بعد ہمیں ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد زیدیؔ نے شاعری پر کم توجہ کی اور تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تعمیری ادب کے پیروکار رہے۔

(۲)

۱۹۴۷ء سے پہلے علی جواد زیدی جیسے آزادی کے متوالوں کی شاعری کا اہم موضوع ملک کو غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ لیکن آزادیٔ ہند کے بعد جہاں بہت سے خوابوں کی تعبیر مکمل ہوئی وہیں اس کا ایک دوسرا رخ بھی سامنے آیا۔ انگریز ہندوستان سے جاتے جاتے فرقہ واریت اور تقسیم ملک کے سوغات بھی دے گئے۔ آزادی کا سورج لاکھوں بے قصور لوگوں کے خون کے ساتھ نمودار ہوا۔ ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ایک نیا ملک پاکستان وجود میں آیا۔ جس کی بنیاد قتل و غارت گری، لوٹ مار اور افراتفری کے ماحول میں رکھی گئی۔ فسادات کی آگ سے تمام ہندوستان جل رہا تھا۔ سیاست کے کھوکھلے پن سے انسان سیاست سے بے زار ہو گیا تھا۔ انسانی زندگی کی جیسی بے حرمتی اور پامالی اس دور میں ہوئی اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی ملے۔ خوابوں کے بکھرنے اور ٹوٹنے کی وجہ سے یہ دور مزید افراتفری اور انتشار کا شکار ہوا اور پہلے کے تمام رجحانات کھوکھلے اور بے جان نظر آنے لگے۔ پروفیسر شمیم حنفی

نے ''نئی شعری روایت'' میں آزادی کے بعد کے ادبی ماحول کے متعلق لکھا ہے:

''ملک کی تقسیم کے خون آشام دور اور اس کے بعد کے زمانے کی صعوبتوں نے نئے شعرا کے ذہن میں دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کے روز افزوں تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی بحران کے نقوش ازسرنو تازہ کر دیئے ہیں۔ جدید تہذیب کے اجتماعی اور انفرادی تشدد نے رفتہ رفتہ انہیں اس منزل تک پہنچا دیا جہاں ہر لطیف اور رومانی تصور کے دروازے ان پر بند ہوگئے۔ مہاجروں کے لٹے پٹے قافلے نے تقسیمِ ملک کے بعد جلاوطنی کی زندگی شمار کرتے ہوئے انہیں اس پہلی ہجرت کی یاد دلائی جس نے آدمؑ کو ان کی جنت سے نکال کر امتحان و آزمائش کی ایک نئی راہ پر لگا دیا تھا۔ قومی حکومتوں کے قیام کے بعد صنعتی ترقی کے منصوبوں، اجڑے ہوئے دیہاتوں اور پھیلے ہوئے شہروں نے انہیں صنعتی زندگی کے جبر اور سرد مہریوں کا احساس دلایا اور وہ یہ سوچنے لگے کہ مشرق اب اپنی رضا سے مغرب کی مادیت زدگی کے سیلاب کی زد پر خود کو لاتا جا رہا ہے۔ ایک شدید المیاتی احساس اپنی ہی نگاہوں میں خود کو مجرم سمجھنے کا انداز، اور اپنی بے راہروی کو الٹی یا الجھی ہوئی سمتوں کے سفر سے تعبیر کرنے کا سلسلہ اسی موڑ پر شروع ہوتا ہے اور اسی لئے ان کے محرکاتِ ذہنی، مقامی اور محدود ہوتے ہوئے بھی دھیرے دھیرے ایک آفاقی تناظر کی شکل اختیار کرتے گئے۔''

یہ ایک بدلتے ہوئے سماج کی عکاسی ہے جس کی وجہ سے آزادی کے بعد کی شعری روایات میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور ترقی پسند تحریک سے الگ ایک رجحان پیدا ہوا جسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ یہ دراصل تحریک کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ اس زمانے کے شعرا میں ایک رجحان کی حیثیت سے ابھری اس لئے اسے ایک ادبی رجحان ہی کہا جاسکتا ہے۔

جدیدیت کا رجحان یوں تو مغرب سے اٹھا لیکن ہندوستان میں یہ رجحان ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے بیچ بتدریج ابھرا۔ اس کی کچھ سیاسی اور سماجی وجوہات تھیں۔ ہندوستانی عوام جدوجہد آزادی کے لئے کوشاں تھے اور ان کے سامنے ایک نصب العین ، ایک راستہ، ایک منزل تھی۔ زندگی کی اونچی قدروں کے ساتھ ہندوستان برابر ذہنی و جذباتی ترقی کر رہا تھا۔ نیز ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا زور تھا اور یہ تحریک زمانے کے موافق تھی اور اس میں آزادی دلانے کا خالص جذبہ تھا لیکن آزادی کے بعد ماحول یکسر بدل گئے۔ سیاسی و سماجی حالات میں تبدیلی آئی۔ لہٰذا ترقی پسند تحریک گزرتے وقت کی آواز محسوس ہونے لگی۔

ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین آزادی کے بعد اشتراکیت کا اعلان کھلے ڈھنگ سے کر رہے تھے اور اس کی نوعیت بھیمڑی کانفرنس کے بعد سیاسی ہوگئی تھی۔ لہٰذا نئے شاعروں نے ترقی پسند موضوعات کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ فرد کی تنہائی، درد و کرب، ذات کے المیے اور اندرونِ ذات کے موضوعات کو اپنایا۔ جدیدیت کے مخصوص موضوعات کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تصنیف ''نئی شعری روایت'' میں لکھا ہے:

> ''زندگی کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کا احساس، بیچارگی اور نامرادی کے حوصلہ شکن تجربے اور علم کی پیاس بجھانے کے لئے

کائنات کی تسخیر کے منصوبے، دنیا سے دوری کا خیال اور ایک نئی دنیا
کی تعمیر کا خواب، حال سے پابستگی اور ماضی کے بازدید کا جذبہ اور
مستقبل کے امکانات کی جستجو، تھکن اور لاحاصلی کا کرب اور اندیکھی
منزلوں کی تلاش، فطرت کے ہر بھید کو تعقل کی روشنی سے بے حجاب
کرنے کی ہوس اور ایک گونا گوں بے خودی کا شوق۔''

یہی وہ موضوعات تھے جن کی بنیاد پر جدیدیت کے رجحان نے فروغ پایا اور اس سے متاثر ہونے والے شاعروں نے اسے اپنایا۔ نئی شاعری میں جدیدیت کا یہ غالب رجحان زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہا اور ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت اقدار کو لے کر نئی شاعری نئی آب و تاب سے نمودار ہوئی۔ اب اس میں اجتماعی و داخلی، شخصی و سماجی حالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ زمانے سے آنکھ ملا کر چلنے کی ہمت کی لے بہت واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس نئی شاعری میں اجتماعی زندگی بھی تھی اور فرد کی شخصیت کے رموز و علائم بھی۔ اس طرح شاعر نے اپنی ذات کے انکشاف کے ساتھ ساتھ زمانے کی بے راہ روی، نابرابری وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ اس نئی نسل نے جس میں چند پرانے شعرا بھی شامل تھے ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت اقدار کا اپنی شاعری میں ایک ساتھ اظہار کیا۔ ان میں فیضؔ، سردار جعفریؔ، جانثار اخترؔ، علی جواد زیدیؔ، مخدومؔ محی الدین، باقرؔ مہدی، خلیلؔ الرحمٰن اعظمی، وحیدؔ اختر، مجیدؔ امجد اور عمیقؔ حنفی وغیرہ اہم ہیں۔

آزادی کے بعد اردو ادب میں میرؔ کی افادیت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ وہ مشترکہ سیاسی و سماجی حالات جو زمانۂ میرؔ اور آزادی کے بعد کی ہندوستانی فضا میں پائے جاتے ہیں۔ بازیافت میرؔ کے بعد بہت سے شعرا کو میرؔ کے کلام کے مطالعہ پر مجبور

کیا اور بیشتر شعرا نے میرؔ کی پیروی کی۔ جن شعرا نے میرؔ کی کامیاب پیروی کی ان میں ابن انشاؔ، خلیلؔ الرحمٰن اعظمی، ناصرؔ کاظمی اور احمد مشتاقؔ وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ نئی شاعری میں لاشعوریت اور وجودیت، تنہائی اور عرفان ذات جیسے موضوعات بھی ایک غالب رجحان کی شکل میں نمودار ہوئے۔ تنہائی اور عرفان ذات کے ماننے والوں میں شمس الرحمٰن فاروقیؔ، محمدؔ علوی، عمیقؔ حنفی، کمارؔ پاشی اور شہریارؔ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن بعد میں اردو ادب میں روایتی تشبیہوں کو چھوڑ کر نئے استعاروں اور علامتوں کو اپنایا جانے لگا۔ اس طرح شاعری کے اسلوب اور ہیئت مین ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ نئے خیالات کے تجربے کے لئے نئے پیرایۂ بیان کو اپنایا گیا۔ نئی شاعری میں علامت نگاری بھی ایک خاص رجحان کی حیثیت سے سامنے آئی اور بیشتر علامتیں موجودہ زندگی اور معاشرے سے لی گئیں۔

یہاں پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعد جو رجحانات سامنے آئے ان رجحانات سے پہلے ایک اور رجحان ہمارے ادب میں آیا جسے تعمیری ادب کا نام دیا گیا۔ اس رجحان کے بانی علی جواد زیدیؔ ہیں۔ زیدیؔ بنیادی طور پر ترقی پسند رجحانات کے حامی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ زیدیؔ ادب میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''تعمیری ادب'' میں لکھا ہے:

> ''تعمیری ادب ترقی پسند ادب کی طرح کوئی تحریک نہیں ہے۔ در حقیقت ترقی پسندی اور تعمیر پسندی میں اتنی قدریں مشترک ہیں کہ لوگ جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے ہوتے ہوئے تعمیر پسندی کے نعرے کی کیا ضرورت تھی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ترقی

پسندی ہی کی ایک شکل تعمیر پسندی بھی ہے۔''

گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بھیمڑی کانفرنس کے بعد ترقی پسند تحریک کے انتہا پسندوں نے ادب کو بالکل محدود کر ڈالا تھا اور ان کی نعرے بازی کی وجہ سے ادب کی صحت ہی نہیں بلکہ افادیت بھی مشتبہ ہو گئی تھی۔ تعمیری ادب کا رجحان بھی اس انتہا پسندی کا ایک ردعمل تھا۔ خود علی جواد زیدیؔ نے بھی تعمیری ادب کو ترقی پسند ادب سے الگ نہیں کیا بلکہ انہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ تعمیری ادب، ترقی پسند ادب کی توسیع اور اس کی تکمیل ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی کتاب ''جدید اردو تنقید اصول و نظریات'' میں لکھا ہے:

> ''تعمیری ادب کوئی تحریک یا ادب کے میدان میں کوئی سیاسی گروہ نہیں ہے۔ ان کا نظریہ صرف یہ تھا کہ غلامی نے جو منفی نقطۂ نگاہ پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے ہم ہر چیز میں کوتاہی، کمی اور خرابی ہی دیکھتے تھے وہ آزادی کے بعد ختم ہو جانا چاہئے۔ اگر ملک کو ترقی دینا ہے، عوام اور ملک کے غریب طبقہ میں خوشحالی لانی ہے تو اس منفی رویے کو تعمیری نقطۂ نگاہ سے بدلنا ہوگا۔''

جہاں تک علی جواد زیدیؔ کی نظموں کا تعلق ہے انہوں نے سیاسی موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی موضوعات خصوصاً ملک کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ آزادی سے پہلے بھی انہوں نے نرم و مانوس لہجہ اپنایا اور آزادی کے بعد بھی ان کی شاعری میں وہ لہجہ برقرار رہا۔ آزادی کے بعد اپنی ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ سے انہوں نے شاعری بہت کم کر دی تھی لیکن انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان

میں تکنیک اور ہیئت کے کامیاب تجربے کئے۔ انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں اور دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کئے اور اس دوران سفر جو تجربات سامنے آئے انہوں نے اپنی شاعری میں اسے پیش کر دیا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زیدؔی کی شاعری ان کی زندگی کا سفر نامہ ہوتے ہوئے بھی اس وقت کے حالات کی عکاس ہے۔ زیدؔی نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا ہے باوجود اس کے کہ ان کا ملک آزاد ہو چکا ہے لیکن ان کے نقطۂ نظر سے آزادی کی جڑیں کمزور ہیں، اب بھی سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ مشورہ دیتے ہیں ؎

آج بڑھنا ہے دل و جان سے منزل کی طرف
آج بڑھنا ہے نئی شان سے منزل کی طرف
اپنی عادت ہے کہ آنکھوں میں بھرے جامِ سرور
ہم نکل جاتے ہیں تاریکیٔ ماحول سے دور

سرور کا جام جب تک آنکھوں میں نہیں بھرا ہوگا اس وقت تک ہم تاریکی سے نہیں نکل سکتے اور چونکہ ہمیں ہندوستان کی تعمیر میں حصہ لینا ہے اور ہر انجام کے بعد ایک دوسرا انجام ہے اس لئے آج کے انجام سے ہمیں گھبرانا نہیں ہے بلکہ مطمئن رہنا چاہئے ؎

ہو کے نیرنگیٔ و کج خلقیٔ موسم کا شکار
گرتی ہی رہتی ہے ہر روز پرانی دیوار
اور پھر وقت ہی بن جاتا ہے اس کا معمار
ہر کھنڈر اک نئی تعمیر کا پیغام بھی ہے

اپنی ایک دوسری نظم ''نئی سحر'' میں یہ کہتے ہیں کہ اب ہر شخص بیدار ہو گیا

ہے۔ ہندوستان ہی نہیں، ایشیا ہی نہیں بلکہ افریقہ میں بھی قربانی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور جب یہ قربانی کا جذبہ نمودار ہو گیا ہے تو اس کے بعد تعمیر و ترقی کا ہونا ضروری ہے ۔

بوئے عطر و گل اڑی ہے خلوت تعمیر سے
آدمی نے پھر سجائی ہے ترقی کی برات
راستوں میں منتظر ہیں بچے بوڑھے نوجواں
لے کے آتا ہے عروس عیش نو شاہِ حیات

لیکن اس اطمینان کے بعد کہ اب انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہے کیا خاموشی بہتر ہے؟ اور یہ بھی صحیح ہے کہ خاموشی میں حیات کا ایک پہلو مضمر ہے لیکن بہت سی جگہیں ایسی ہیں جہاں خاموش رہنا گناہ ہے۔ زیدیؔ کا خیال ہے کہ اب ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ خاموش نہیں رہنا چاہئے ۔

ہاں یہ سچ ہے کہ خموشی بھی ہے اک طرزِ حیات
کہتے ہیں اس سے بھی بن جاتی ہے بگڑی ہوئی بات
اس سے بجھ جاتی ہے انگاروں پہ جلتی ہوئی رات
لیکن اے دوست کچھ ایسے ہیں نرالے حالات
جن سے لیتے ہیں اثر غیر کے بھی احساسات
اور میں نے تو سنے وقت کے وہ اعلانات
جن کو سن کر کوئی خاموش نہیں رہ سکتا
بزمِ ابلیس کو بھی ہوش نہیں رہ سکتا

لیکن زیدیؔ ان حالات سے پریشان نہیں ہیں کیونکہ ان میں تخلیق کا ذوق بھی

ہےاورتعمیر کا شوق بھی۔اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ ذوقِ تخلیق اور کاوشِ تعمیر ہی زندگی ہے ۔

مطلعِ وقت کے نئے آثار
اک نئی صبح کے نقیب بھی ہیں
یہ سنہری کرن یہ پہلی پھوار
روزنِ در سے جھانکتی دنیا
وصل ہے زندگی ہے اے مرے دوست
ذوقِ تخلیق و کاوشِ تعمیر
زندگی بس یہی ہے اے مرے دوست

ذوق تخلیق اور کاوش تعمیر اپنے عزیز وطن کے لئے ہے اور وطن چونکہ انہیں ہر چیز سے عزیز تر ہے اس لئے اس کی تعمیر اور ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔علی جواد زیدؔی وطن ہی کو اصل حیات سمجھتے ہیں اور وطن سے جنون کی حد تک عشق کرتے ہیں اس لئے کہ وطن ہی کے دم سے ان کی ہستی کا وجود ہے۔ان کی نظم ''یارانِ دکن'' کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

وطن مرا مری دنیا کا ایک حصہ ہے
وطن پرستی زیدؔی جہاں پرستی ہے
مگر وطن یہ وطن یہ مرا عزیز وطن
مری حیات ہے میرا جمال ہستی ہے
وطن کے ایک اشارے پہ جاں لٹادوں گا
وطن کی راہ میں جانِ عزیز سستی ہے

وطن کے ساتھ ساتھ زیدیؔ کو وطن والوں سے بڑی انسیت ہے۔ وہ بہت سے لوگوں سے متاثر ہیں ان میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو بہت اہم ہیں۔ وہ گاندھی جی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہیں لیکن ان کی عظمت کے منکر بھی نہیں ہیں۔ ان کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

گداز قلب و نظر شمع بھی تھا تیشہ بھی
پگھل پگھل گئے کہسار گر پڑی دیوار
بھلا یہ کس میں تھا دم خم کہ راستہ روکے

علی جواد زیدیؔ گاندھی جی کے قتل سے بہت زیادہ غمگین ہیں اور ان کا غم زدہ دل یہ سوال کر رہا ہے کہ آخر گاندھی جی کی کیا خطا تھی ؎

یہ ناتواں سا مسافر جفا کی راہوں کا
تمام عمر نبرد آزما رہا غم سے
کوئی سوال لئے سینۂ شہادت میں
کسی جواب کا طالب ہے آج بھی ہم سے

علی جواد زیدیؔ کا راستہ اہنسا کا راستہ ہے۔ ان کا راستہ پریم و محبت کا راستہ ہے۔ زیدیؔ پریم ہی کو ایسا راستہ سمجھتے ہیں جس پر چل کر ہر ہندوستانی کا بھلا ہو سکتا ہے اسی لئے وہ ہر ایک کو پریم کے راستے پر دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ اسی کے ذریعہ ملک و قوم متحد رہ سکتی ہے اور پریم اور محبت ہی کے ذریعہ قومی یکجہتی پنپ سکتی ہے۔ اس لئے زیدیؔ اسی راستے پر گامزن ہیں ؎

ماضی کے اوراق کو الٹو جیسی جوانی ویسا بچپن

فکر نہ بدلی روح نہ بدلی بدلا تو دامن پیراہن

ہم نے تو اس وقت نہ پوچھا تم ہو مراٹھایا آسامی

اعظم گڑھ کے رہنے والے یا موہانی یا نگرامی؟

اسی ڈگر سے آنا جانا زیدیؔ کا دستور ہے پیارے

پریم ڈگر ہی اس کی ڈگر ہے مانا رستہ دور ہے پیارے

ان چند اشعار کے مطالعے سے زیدیؔ کی ذہنی اپج اور ان کے جذبات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ زیدیؔ کے یہاں عشق و محبت، پریم اور قومی یکجہتی کے یہ تصورات ابتدا ہی سے تھے اور ان کا یہ کلاسیکی انداز قدیم ادب کے غیر معمولی مطالعہ کی وجہ سے ہے۔

ہندوستان کے رہنماؤں میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے زیدیؔ کو بے انتہا عقیدت ہے باوجود اس کے کہ زیدیؔ مارکسی نظریات کے حامی ہیں لیکن زیدیؔ ان کی رہبرانہ عظمت کے منکر نہیں۔ وہ بعد میں جواہر لال نہرو کے ترقیاتی کاموں کے ہم نوا بھی ہوئے اور اسی لئے انہوں نے 'تعمیری ادب' کے نام سے ایک تحریک چلائی۔ وہ نہرو جی کو جدید ہندوستان کا معمار تصور کرتے ہیں۔ نہرو جی سے ان کی عقیدت کو ان کی نظم ''مرا نام لینے والو'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظم نہرو جی کے انتقال پر لکھا گیا ایک شخصی مرثیہ ہے اور زیدیؔ نے اپنے مخصوص انداز میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ قابل دید ہے ؎

کہ ایک نام جواہر بھی ہے مرا لیکن

نیا سماج نئی زندگی نیا بھارت

جو میرے نام نہیں ہیں تو نام کس کے ہیں
یہ ملک وقوم یہ جن گھن یہ جاگتے مزدور
کوئی بتائے یہ اسمائے عام کس کے ہیں
یہ اس بدلتے ہوئے عہدِ نو کے بھارت میں
یہ نغمے صبح کے یہ رقصِ شام کس کے ہیں
نوائے شعر میں کیف و سرور کس کا ہے
ادیبِ عصر کے ہاتھوں میں جام کس کے ہیں
بس اک سوال مجھے تم سے اور کرنا ہے
جو میں تمہارا ہوں زیدیؔ عوام کس کے ہیں
جو ہو سکے تو مرا نام بار بار نہ لو

خودکلامی اور نیا سال زیدیؔ کی اس وقت کی نظمیں ہیں جب کہ جدیدیت کا دور دورا تھا۔ زیدیؔ جدیدیت کے حامی نہیں ہیں۔ ان کا تصور یہ ہے کہ وقت اور حالات کے مطابق شاعری وجود میں آتی ہے اور سچا فنکار اور شاعر وہی ہے جو وقت اور حالات کو برت سکے۔ زیدیؔ نے بھی اسی لئے جدید لب و لہجے میں نظمیں لکھیں اور جدید ہیئت اور تکنیک کے تجربے کئے پھر بھی وہ رجائیت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی نظم ''خودکلامی'' رجائیت کے پہلو کو اجاگر کرتی ہے ؎

رام اور کرشن کی لے گونجے گی سقراط و موسیٰ اٹھیں گے
شبیر و عیسیٰ ابھریں گے میں شک کرنے والا کہاں کا
انسانی امید کے نغمے نانک اور گوتم چھیڑیں گے

طوفاں کی صورت دھارے گا وقت کا تیور ترچھا بانکا
آج بھی کوئی ہمت باندھے اس سے الجھے اس کو ٹوکے
آج بھی کوئی سواگت کرلے خوش ہوکر رنج وحرماں کا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا

زیدیؔ نے اس نظم میں جس حقیقت بیانی سے کام لیا ہے اس اعتبار سے نظم کا آخری بند قابل دید ہے ۔

ایک بھیانک خاموشی میں چاند بچارا کھویا کھویا
اک پیلی سی چادر اوڑھے جاگا جاگا سویا سویا
گھبرایا سا الجھا الجھا ہانپ رہا ہے کانپ رہا ہے
اکثر شاید یہ بھی ہوا ہے خود بھی رویا میں بھی رویا
جھوٹی محبت جھوٹے یہ آنسو عشق ومحبت پہلو بہ پہلو
چاند مگر پھر بھی تجھے بخشا تو نے غبار غم بھی تو دھویا
تاریکی میں لپٹی دنیا سہمی سہمی ڈول رہی ہے
ڈول رہی ہے بول رہی ہے اب وہ کاٹو جو پہلے بویا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا دنیا چھوٹی چاند بھی چھوٹا
یہ تاریکی فکرِ سحر ہے یہ خاموشی اک لبِ گویا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا

آزادی کے بعد بھی زیدیؔ نے کئی کامیاب آزاد نظمیں کہی ہیں ۔ان میں 'پھول ،کڑی دھوپ، ماحول، عجیب تنہائی' اور 'تازہ امتحان' وغیرہ بہت اہم ہیں۔

زیدؔی نے ان نظموں میں وقت اور ماحول کو سمیٹ دیا ہے اور اپنی ذات سے دور اور سماج سے کسی حد تک قریب آ گئے ہیں۔ پھول بظاہر ایک تاثراتی نظم ہے لیکن زیدؔی نے پھول کے پس منظر میں جو درس دیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ نظم کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زیدؔی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ عزم و عمل کا مکمل نمونہ ہیں۔ یہ نظم اتحاد و اتفاق کی بہترین مثال ہے۔

بے گنتی رنگوں کی گودی میں ہم سب نے آنکھیں کھولیں
لاکھوں ہی شکلوں میں کھلے ہم لاکھوں خوشبوئیں پھیلائیں
لیکن مالے کی وحدت میں گندھ جانے پر ایک ہوئے
شہد کے شیریں جاموں سے بھونروں کا استقبال کیا
لاتعداد ہیں لیکن ہم سب ایک ہیں اپنے وچاروں میں
مورتی کے چرنوں میں پہنچ کر ہم سب کے حق یکساں ہیں
پھلوں کو ہم پالیں پوسیں گے ممتا کے پیار لگن سے
ہم جس طالب تک پہنچیں گے سکھی رہے گا وہ تن من سے

زیدؔی اس نظم میں مزید کہتے ہیں کہ پھول کا مقصد یہ نہیں کہ وہ مرجھائے اس لئے کہ مرجھا جانا پھول کی بدنصیبی ہے۔ اس نظم کے ذریعہ زیدؔی نے یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہر شخص کو، ہر شے کو افضل و اعلیٰ بننے کا حق ہے اور اسے وہ حق حاصل کرنا چاہئے۔

جیون میں بھی ہم مرجھانے والے پھول بنیں کیوں؟
ایسے پھول بنیں جو نذرِ یزداں کے تو قابل ہو

بے مقصد مر جھا نا تو گل بننے کا مقصو د نہیں
جئیں تو افضل پھول کی صورت کھلیں تو اعلیٰ پھول کی صورت
اور جیون کے تپتے نگر میں کچھ تو جیون کا پھل پائیں

'کڑی دھوپ' زیدیؔ کی ایک طویل نظم ہے جس میں زیدیؔ نے کلاسیکی روایات کو نظر انداز نہیں کیا گو کہ یہ آزاد نظم ہے لیکن ہیئت اور اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت ہی معیاری نظم ہے۔ یہ نظم ہی نہیں بلکہ ہماری قدیم روایات کی مختصر تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب کی امین بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک آشا اور امید کی کرن دکھائی دیتی ہے ۔

بابل یونانی تہذیبیں ہندی ایرانی تہذیبیں
تپ تپ کر نکھری تہذیبیں
ہم سے اب کیا مانگ رہی ہیں
دھوپ کی تیزی ہر چہرے پر آب و تاب نئی لائی ہے
نیا پسینہ نئی توانائی کی رگ رگ سے کھینچ کھینچ کر
ہر ابرو کو کمان بناتا ہر مژگاں کو تیر
سینے کے ہر زیر و بم میں ایک نئی امید جگاتا
آوازوں کے کولاہل میں مستقبل کے گیت گھولتا
نئے سویرے کے قدموں میں آشا کی پائل چھنکاتا
نئی دلہن کی مند چال سے شوخی سرمستی برساتا
تیرے جواں روشن ماتھے پر موتی کی مالا ہے پسینہ

میرے باہمت سینے میں مستی کی جوالا ہے پسینہ
ہم ماتھے سے پسینہ پونچھیں جام اٹھائیں ساز اٹھائیں
جب رکتے قدموں کو دیکھیں مستانہ آواز اٹھائیں
اب کے کڑی ہے دھوپ ہے ساتھی
اب کے پھر اک جام اٹھائیں

'ماحول، عجیب تنہائی ، با آسماں نیز پرداختی' وغیرہ زیدیؔ کی اچھی نظمیں ہیں۔'با آسماں نیز پرداختی' انسان کے چاند پر جانے کے بعد کی ایک تاثراتی نظم ہے لیکن اس نظم میں زیدیؔ نے سائنس کے تجربات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔وہ خوش ہیں کہ انسان ترقی کی منزل پر گامزن ہے اس لئے کہ زیدیؔ انسانوں کی ترقی ہی دیکھنا چاہتے ہیں ؎

اک نئی راہ ملی انساں کو
گھر کی تنہائیوں سے چاند کی تنہائی تک
رات بے برگ ونمو گیلی چمکتی ہوئی دھول
آدمی چاند کے آنگن سے چرالایا ہے
تجربہ گاہ میں اب چاند کا اک ٹکڑا ہے
کوئی سائنس کے دل سے پوچھے
ذرۂ خاک نہیں
راہ محبوب میں بکھرے ہوئے غنچے کی طرح
حجرۂ وقت کی آغوش میں پلتے ہوئے بچے کی طرح

اک نیا دور ہے اک دنیا ہے

'عجیب تنہائی' زیدؔی کی طویل نظم ہے۔ اس میں زیدؔی باوجود اس کے کہ ایک بڑے شہر میں رہتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں۔ اس طویل نظم میں زیدؔی نے بہت سے مناظر کو پیش کیا ہے۔ کبھی قدیم تہذیب کی یاد دلاتے ہیں، کبھی شہر کی مسموم فضا کی کیفیت بتاتے ہیں اور کبھی شعر و ادب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ اپنے آپ کو تنہا اس لئے سمجھتے ہیں کہ انہیں ماں کی ممتا نہیں مل پا رہی ہے۔ ماں سے زیدؔی کو بہت انسیت ہے لیکن زیدؔی کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں ماں کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت کو وہ کیا جانے گا جو دایہ کے رحم و کرم پر پلا ہو۔ اس نظم میں زیدؔی نے موجودہ دور کے حالات کی بہترین عکاسی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر ماں اور اس کی ممتا نہیں ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی تنہائی نہیں ہے ۔

اور اگر ماں نے بھی دفتر کی نظافت کے لئے
اس نئی نسل کو دایہ کے لئے چھوڑ دیا
دایہ سکوں کے عوض پیار نہیں دے سکتی
پیار بھی دیدے تو اسرار نہیں دے سکتی
جن سے فردا کے تصور کو غذا ملتی ہے
جن کے بل بوتے پر ہر نسل جواں ہوتی ہے
دایہ کی گود کے پالے بچے
ماں کی آغوش کی گرمی جنہیں کم مل پائی
یہ کبھی جان نہیں پائیں گے

مامتا کیا ہے یہ ماں کتنی بڑی نعمت ہے
اس عجب طرح کی تنہائی میں
جس میں دایہ تو ملی پیار نہیں مل پایا
اے مرے ننھے سے دل
دیکھنا یہ تری ماں
تیرے مستقبل تابندہ کی معمار یہ ماں
کھونے نہ پائے

'تازہ امتحان' میں علی جواد زیدیؔ نے بیسویں صدی کے گزرنے پر ان واقعات ولمحات کو علامتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے جسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نظم میں کہیں پر آزادی کی جدوجہد کے واقعات ہیں تو کہیں آزادی کے بعد ہجرت کا کرب اور فرقہ وارانہ فسادات۔ نظم کا یہ بند بطور مثال پیش کیا جاتا ہے ؎

گزرتے وقت کی روکون روک سکتا ہے
صدی کے بیتنے پر فکر محوِ حیرت ہے
کہاں گئی وہ تمنا وہ شوقِ بے پروا؟
کدھر گئے وہ جواں سال جدوجہد کے دن؟
وہ سر پھرے وہ جنونِ شفق کے پروردہ
جو میرے درد کو اپنا ہی غم سمجھتے تھے
جو اپنے پیار کو دنیا میں بانٹ دیتے تھے
زمانہ بیتتا ہے کروٹیں بدلتا ہے

صدی کی بات ہے دو ایک دن کی بات نہیں
اسی زمیں پہ شہیدوں کا کارواں ٹھہرا
شہادتیں جو کبھی رائیگاں نہیں جاتیں
اسی زمین پہ سجدے کئے ہیں غیروں نے
کہ اس زمین کی نظروں میں کوئی غیر نہیں
کوئی سبب تو ہے جو یہ خیال آتا ہے
رہِ وفا میں کوئی تازہ امتحان ہے کیا؟

مندرجہ بالا نظموں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ زیدیؔ کے یہاں ایک انسان کا دل تھا۔ وہ ہر ایک کے درد کو اپنا درد تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سماج اور حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت ہے۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے چاہے انہیں جیل جانا پڑے یا لاٹھی کھانی پڑے۔ زیدی اپنے ملک ،اپنی قوم، اپنے وطن کی بربادی کو نہیں دیکھ سکتے چاہے آزادی سے پہلے انگریزی سامراج کے ہاتھوں یا موجودہ دور میں سماج کے غنڈہ عناصر کے ہاتھوں۔ انہوں نے ہر دور میں سماج کے اندر پنپنے والے ان گھنونے عناصر کی مخالفت کی ہے جو ہمارے ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اور یہ سب صرف اس بنا پر ہے کہ انہیں اپنے ملک سے، وطن سے اور قوم سے سچی محبت اور وابستگی ہے۔ زیدیؔ نے اپنی نظم 'وابستگی' میں اسی وابستگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ نظم زیدیؔ نے ۱۹۷۷ء میں تہران میں لکھی تھی جس میں احساس و آہنگ کا اتنا صحیح امتزاج دکھائی دیتا ہے جو ناقابلِ بیان ہے۔ اس نظم کا طرزِ اظہار مقامیت کی سطح سے ذرا بلند ہے مگر لہجہ مستند اردو ہی کا ہے۔ اس نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں ؎

میرے گھر کے دکھوں کی طرح بیکراں ساری دھرتی کو گھیرے ہوئے آسماں
اور مرے سر پہ صدیوں کا بارِ گراں میں دہکتی ہوئی آگ پر بھی چلا
آگ ہی آگ تھی کچھ بچا کچھ جلا پھر بھی ہر راہ سے راہ کے موڑ سے
راہ کے سوکھے بے برگ اشجار سے زخمی تلووں میں چبھتے ہوئے خار سے
ہر زمانے کی بے دھار تلوار سے
ایک وابستگی، ایک دلدادگی

زیدیؔ کی یہ وابستگی ختم ہی نہیں ہوسکتی چاہے اس راہ میں کتنی ہی صعوبتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑے اور زیدیؔ کی یہ وابستگی چاہے ادب سے ہو یا زندگی کے دوسرے مسائل سے ان کی آخری سانس تک باقی رہی۔

علی جواد زیدیؔ کی نظموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زیدیؔ نے سیاسی موضوعات کے ساتھ ساتھ سماج کی تعمیر و ترقی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ اجتماعی حسن اور خیر کے نظریۂ حیات کے ساتھ وابستگی کو خیرِ اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ علی جواد زیدیؔ نے اپنی مخصوص فکر سے سماجی کشمکش کو اس طرح پیش کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ترقی پسند شعرا میں منفرد ہوگئے کیونکہ وہ اجتماعی تقاضوں اور انفرادی میلان کے مابین گہری مطابقت پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جدت پسندی کے دور میں بھی وہ اپنے آپ کو بہت لئے دئے رہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ بہت ٹھوس کہا ہے۔ آزادی کے بعد مشاعروں میں جانا تقریباً ترک کردیا تھا اور جب وہ جموں و کشمیر چلے گئے تو کشمیر کی اس مترنم اور پرسکون راتوں میں ان کا دل تحقیق کی طرف لگ گیا۔ زیدیؔ نے تحقیق و تنقید کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

علی جواد زیدیؔ اور شخصی مرثیہ

اصناف ادب میں مرثیہ کی قدامت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جتنی قدیم نسل انسانی کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم تاریخ مرثیہ بھی ہے اور یہ بات مسلم حیثیت رکھتی ہے کہ صنف مرثیہ کا آغاز ہی شخصی مرثیے سے ہوا ہے اس لئے کہ حضرت آدمؑ نے اپنے عزیز فرزند جناب ہابیل کے فراق میں جو کلمات رنج وغم اپنی زبان سے ادا کئے تھے اسے ادبی زبان میں مرثیہ ہی سے تعبیر کرنا چاہئیے۔ حضرت آدمؑ کے تاثرات ہوں یا حضرت طالوت کی وفات پر حضرت داؤدؑ کا مرثیہ یا کرونچ پنچھی کے شکار ہونے پر بالمیکی کا اظہار رنج وغم، اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے انہیں شخصی مرثیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ادب عربی میں جہاں اس صنف کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے وہیں فارسی ادب میں بھی اس کی روایت موجود ہے۔

اردو میں اس صنف نے ایک وسیع ادبی تناظر میں اپنا سفر طے کیا ہے۔ شخصی مرثیوں کا نقطۂ آغاز اگر میران جی یا جعفر زٹلی سے مانا جائے تو اس صنف میں ایک طویل مسافت طے کی ہے۔ میر تقی میرؔ نے اپنی اس بیٹی کی تذکرہ غزل کے ایک مطلع میں کیا ہے، جو شادی کے کچھ دنوں بعد انتقال کر گئی تھی۔ یہ مطلع ایک پورے مرثیے کی حیثیت رکھتا ہے:

کھلا ہم پہ یہ اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تجھے بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

وہیں سلطان العلماء سید محمد مجتہد کے چھوٹے بھائی سید حسین علیین مکان کے انتقال پر سلطان العلماء کے جذبات کی عکاسی شاگرد مرزا دبیر میاں مشیر نے کچھ اس طرح کی ہے:

آنسو رواں تھے غیرت الیاس کے لئے
شبیر یوں ہی روئے تھے عباس کے لئے

میر یا مشیر کے یہ اشعار ہوں یا غالب کا مرثیۂ عارف یا اقبال کا مشہور شخصی مرثیہ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' یہ شخصی مرثیے کا وہ رخ ہیں جن کی خلش اور کسک میں ذاتی دکھ اور نجی تاثرات ہیں لیکن ایک بڑی سطح پر ان شخصی مرثیوں کا تخلیقی پھیلاؤ زیادہ ہے جو اکابر قوم وملت کے متعلق کہے گئے ہیں جس پر سب سے زیادہ زور حالی نے دیا۔ حالی تقلید میں ان کے عہد کے شعرا نے جہاں بے شمار شخصی مرثیے کہے وہیں بعد کے شعرا نے بھی ان کا اتباع کیا جن میں حامد جونپوری، نسیم امروہوی، صفی لکھنوی، مہدی حسین ناصری، شمیم کرہانی اور علی جواد زیدی اہمیت کے حامل ہے۔

علی جواد زیدی نے جن شخصیات کے مرثیے کہے ہیں ان میں جہاں مجاہدین آزادی اور مشاہیر ادب ہیں وہیں ان کے مراثی ذاتی نوعیت کے بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے شعری سرمائے میں کربلائی مرثیے نہیں ہیں لیکن ان کی کربلائی مرثیے سے دلچسپی مسلم ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مرثیے پر مختلف مضامین کے علاوہ کئی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ انہوں نے 'میر انیس'، جدید مرثیے کے بانی میر ضمیر لکھنوی جیسی تحقیقی کتابیں لکھیں وہیں ذکر انیس، ضمیر استاد دبیر، انیس کا نظریۂ فن، مرثیے کی فنی حیثیت، امید فاضلی کی مرثیہ نگاری جیسے اہم مضامین بھی سپرد قلم کئے۔

علی جواد زیدی نے نہ صرف یہ کہ اردو میں رثائی خدمات انجام دی ہیں بلکہ انگریزی اور ہندی قارئین کو بھی رثائی ادب سے متعارف کرایا ہے انہوں نے انگریزی میں میر انیسؔ پر ایک اہم کتاب لکھی جسے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے شائع کیا اور اس کتاب کا اردو اور ہندی ترجمہ بھی ترمیم واضافے کے ساتھ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ان کتابوں اور مضامین کے علاوہ مرثیے کے میدان میں زیدی نے ایک اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ لکھنؤ اور دکن کے مرثیہ نگاروں کے بیچ کے فاصلہ اور خلا کو پر کرنے کے لئے دو جلدوں میں 'دہلوی مرثیہ گو' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی۔اس سلسلے میں زیدی نے سب سے پہلے ایک تحقیقی مقالہ اورینٹل کانگریس میں پڑھا تھا بعد میں مزید تحقیق کے بعد تقریباً سو مرثیہ گو شعرا کے تفصیلی سوانح اور ان کے کلام کا انتخاب جمع کیا اور اس دعوے کو بے بنیاد ثابت کر دیا کہ مرثیہ صرف حیدرآباد اور لکھنؤ میں تھا۔دکن کے بعد دہلی ایک بڑا مرکز ہے جہاں مرثیوں کی پرداخت ہوئی ہے، اس نے ترقی کی ہے۔لکھنؤ اس کے بعد کی منزل ہے جہاں مرثیہ نئے اوج کو پہنچا۔مرثیہ نگاری کی تاریخ میں یہ کتاب ایک سنگمیل کی حیثیت رکھتی ہے اور اب مرثیہ کی تاریخ کو مکمل طور سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔یہ کتاب پاکستان سے نفیس اکادمی کراچی نے بھی شائع کی ہے۔

علی جواد زیدیؔ کے رثائی ادب سے متعلق خدمات کو مختلف ادیبوں، محققوں اور ناقدوں نے سراہا ہے۔پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری نے اپنی کتاب میر ضمیر میں خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنی کتاب 'اردو مرثیے کا ارتقا' میں زیدیؔ کے رثائی خدمات کو خصوصیت کے ساتھ سراہا ہے۔اس کتاب کے بارے میں پاکستان کے مشہور ناقد پروفیسر ممتاز حسین نے لکھا ہے:

'اردو میں تحقیقی درجے کی کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں ہے'

علی جواد زیدیؔ کی رثائی ادب سے دلچسپی جہاں مسلم ہے وہیں انہوں نے حالیؔ کی تقلیدی روش اختیار کرتے ہوئے چھ شخصی مرثیے بھی کہے ہیں۔علی جواد زیدیؔ نے پہلا شخصی مرثیہ گاندھی جی کا 'شمع امن' کے عنوان سے لکھا ہے ۷/ بند کے اس مرثیے میں زیدیؔ نے گاندھی جی کو علامت کے طور پر امن کی شمع کے روپ میں پیش کیا ہے۔اس مرثیے کی خاص بات یہ ہے زیدیؔ نے گاندھی جی کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اس شہید امن وآشتی کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے:

ہر ایک بار اندھیرے کو یہ گماں گزرا کسی بھی شمع کی لو اب نہ تھرتھرائے گی
مگر ہر ایک جگہ شمع کی قطاریں تھیں جدھر جدھر سے اندھیروں کا کارواں گزرا

گاندھی جی کی شخصیت ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے جو رہبرانہ کردار ادا کیا ہے اس سے صرف نظر ناممکن ہے۔گاندھی جی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان کو آزاد کرانا ہے تو ہندو اور مسلمان دونوں کا اتحاد ضروری ہے۔ ملک سے رنگ ونسل اور قومی عصبیت کو ختم کرنا ہوگا جس کے لئے انہوں نے بہت ساری مصیبتیں بھی اٹھائی۔زیر نظر مرثیے میں زیدی نے اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔اسی لئے گاندھی جی نے اس ماحول میں جہاں فرنگی ملک میں نفرت وعداوت کی فصل اگا رہے تھے خود مصیبت جھیلنا گوارا کیا لیکن ان کی کوشش یہ رہی کہ ہندوستان میں اتحاد ویگانگت اور امن وآشتی کی شمع جگمگاتی رہے:

وہ نیم برہنگی کا جلال شاہانہ جو زندگی کو جلا تا رہا دیئے کی طرح

کہ خود جلے تو جلے بزم جگمگاتی رہی   گداز قلب ونظر شمع بھی تھا تیشہ بھی
پگھل پگھل گئے کہسار گر پڑی دیوار   بھلا یہ کس میں تھا دم خم کہ راستہ روکے

مندرجہ بالا اشعار میں زیدیؔ نے آزادی کی جدو جہد کی بڑی خوبصورت تصویرکشی کی ہے۔گاندھی جی کے رہبرانہ کرداراوران کے ہمت وحوصلہ کی شاعر نے داددی ہےلیکن اس دل وجگر والے انسان پر ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ءکوحملہ کیا جائے گااور یہ شمع امن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہوجائے گی۔شاعراس ظلم و بربریت اورانسانیت سوز سانحے پر سوال قائم کرتے ہوئے مرثیہ کااختتام کردیتاہے:

یہ ناتواں سا مسافر جفا کی راہوں کا
تمام عمر نبرد آزما رہا غم سے
کوئی سوال لئے سینۂ شہادت میں
کسی جواب کاطالب ہےآج بھی ہم سے

اورشاعر کی نگاہ میں آج بھی یہ سوال باقی ہے کہ آخر گاندھی جی کی کیا خطاتھی کہ انہیں قتل کر دیا گیا۔علی جواد زیدیؔ کا خیال ہے کہ جب تک دنیا باقی رہے گی یہ سوال بھی باقی رہے گا۔

'شمع امن' سے قبل ایک اور مرثیہ زیدیؔ نے 'قیدی کی لاش' کے عنوان سے لکھا تھاخلیل الرحمان اعظمی نے اس مرثیہ کے بارے میں لکھاہے کہ:

'اردو و فارسی کے شاعر مولانا اقبال احمد سہیلؔ جو جدید شعرا کی اس بدعت کومشتبہ نظر سے دیکھتے تھے۔علی جوادزیدیؔ کی نظم 'لاش' سننے کے بعد کہنے لگے کہ اگر نئے شعرا ایسی آزاد نظمیں لکھیں تو مجھے آزاد نظم

سے کوئی بیر نہیں۔ یہ نظم مہادیو دیسائی کی موت پر لکھی گئی ہے اور زیدؔی کی چند کامیاب نظموں میں سے ہے'۔

(بحوالہ اردو میں ترقی پسند تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی)

زیدؔی نے یہ مرثیہ مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سکریٹری مہادیو دیسائی کی قید کی حالت میں واقع ہونے والی موت پر لکھا ہے۔ مرثیہ کی ابتدا استفہامیہ انداز میں ہوتی ہے:

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
ابھی نمودِ زندگی بسی نہ تھی نگاہ میں
ابھی دریچۂ سحر کھلا نہ تھا
ابھی فسونِ زندگی مٹا نہ تھا
سکوت میں زمانہ تھا
ابھی گزر رہے تھے ہم جوار رزمگاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

مرثیہ کا ایک ایک مصرعہ جہاں شاعر کے جذبات والم آفرینی کی نشاندہی کرتا ہے وہیں متوفی کے تئیں خلوص کا آئینہ دار بھی ہے:

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ دور اپنے آشرم کو چھوڑ کر
یہ اپنے ٹوٹے جھونپڑے سے اپنے منھ کو موڑ کر
نکل پڑا اندھیری رات تھی مگر یہ چل پڑا

کوئی بھی ہو عزیز ہے
کہ اس جری نے جان دی ہے جشن رزم گاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

متذکرہ بالا مرثیوں کے علاوہ زیدؔی کے چار شخصی مراثی اور ہیں (۱) کرب چمن (۲) میرا نام لینے والو (۳) شورشؔ مرحوم (۴) زندہ ہے احتشام ابھی۔ یہ ایسے مراثی ہیں جنہیں اردو کے شخصی مراثی میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ 'کرب چمن' علی جواد زیدؔی کا وہ مرثیہ ہے جسے ذاتی مرثیوں میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ مسدس کی ہیئت میں ۱۰۶ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ زیدؔی نے اپنے خسر سید محمد جواد کوتوال کی مرگ ناگہاں سے متاثر ہو کر لکھا۔ سید محمد جواد کوتوال دائرۂ شاہ اجمل کے رہنے والے تھے جو الہ آباد میں تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ شیخ امام بخش ناسؔخ نے دائرہ شاہ اجمل ہی میں قیام کیا تھا اور شاہ اجمل ہی کی وجہ سے یہ جگہ ہمیشہ علم و ادب و شاعری کا مرکز رہی۔ سید محمد جواد کا انتقال اس رات ہوا جب دائرے میں عید میلا دالنبی ﷺ کا جشن ہو رہا تھا اور ان کے انتقال سے یہ جشن کا گھر عزا خانہ بن گیا۔ مرحوم کو زیدؔی سے خاص انسیت تھی۔ حقیقی بیٹے نہیں تھے لیکن داماد ہونے کے سبب حقیقی بیٹوں ہی کی طرح چاہتے تھے۔ اس مرثیہ میں زیدؔی نے فلسفۂ موت و حیات کے ساتھ ساتھ مرحوم کے سیرت و کردار اور ان کے اخلاق عالیہ کا ذکر کیا ہے۔ مرثیے کی ابتدا شاعر کے احساس غم سے ہوتی ہے:

راستے ساکت چراغ رہ گزر خاموش ہیں
رہ نما سر در گریباں، ہم سفر خاموش ہیں

جانے پہچانے ہوئے دیوار و در خاموش ہیں
ایسی دل تنگی ہے گویا بحر و بر خاموش ہیں
کل فضا ہے دم بخود طوفان کے احساس سے
دم نہ گھٹ جائے مناظر کا وفور یاس سے

شاعر جہاں فلسفۂ موت وحیات کو پیش کرتا ہے وہیں اس منظر کو پیش کر رہا ہے۔ جبکہ محفل میلاد النبیؐ کا انعقاد ہو رہا ہو اور دوسری طرف سید محمد جواد کو تو ال کا جام حیات جھلک گیا۔ فلسفۂ موت وحیات کی اس پیش کش میں شاعر کے رنج وغم کا تاثر تو قابل دید ہے ہی ساتھ ہی ساتھ موضوع کا تیکھا پن بھی قابل توجہ ہے:

رفتہ رفتہ بھر گیا ہے تا بلب جام حیات
گوشۂ غم بن گئی ہے محفل شام حیات
کانپتا ہے یوں لب ارباب پر نام حیات
جیسے ہو بزم طرب بھی لغزش گام حیات
اک خمار آگیں سکوت فکر ہے چھایا ہوا
چہرہ کیا ہے جیسے کوئی جام چھلکایا ہوا

☆

میرے کاشانے پہ کل جشن طرب کا تھا سماں
زندگی تھی خوش خرام و خوش گوار و کامراں
گوشے گوشے سے مسرت کی فراوانی عیاں
ہم سمجھ بیٹھے تھے یہ دور خوشی ہے جاوداں

یہ تو سوچا ہی نہ تھا وہ وقت بھی آنے کو ہے
یہ بساط عیش دم بھر میں الٹ جانے کو ہے

اس کے بعد شاعر دائرۂ شاہ اجمل کی گذشتہ یادوں میں گم ہو جاتا ہے شاعر کو چونکہ روایتوں کا بہت زیادہ پاس ولحاظ ہے اس لئے وہ تڑپ اٹھتا ہے:

خاک اڑتی ہے جہاں وہ خطہ اک گلزار تھا
چپہ چپہ عیش وعشرت کا امانت دار تھا
راحتوں کا ان دنوں کچھ اور ہی معیار تھا
ذہن پر ہلکا سا بھی غم کا تصور بار تھا
آج جا کر دیکھئے تو رنگ گلشن اور ہے
لٹ چکی دولت بہاروں کی خزاں کا دور ہے

اس غم انگیز ماحول میں شاعر اپنے بچپن کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ زیدیؔ چونکہ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے رنج وغم کی اس گھڑی میں شاعر کو اپنی یتیمی یاد آجاتی ہے:

کھیلنے اور رقص کرنے کا زمانہ وقف غم
ہائے طفلی تھے رہین بار رنج الم
اہل دل یہ بھی تو فطرت کا انوکھا تھا کرم
باپ مشفق باپ جس سے زندگی تھی تازہ دم
مجھ کو طفلی کی یتیمی میں سسکتا چھوڑ کر
چل دیا اک آن میں گھر بھر سے آنکھیں موڑ کر

لیکن شاعر اس رنج وغم کے ماحول میں بھی:

مشکلوں کو جھیلتے رنج و تعب سہتے ہوئے
آ لگے ساحل سے آخر ڈوبتے بہتے ہوئے

مگر زیدی کا دل سید محمد جواد جیسے مشفق اور چاہنے والے خسر کے دنیا سے چلے جانے سے رنجیدہ ہو جاتا ہے اور وہ تمام مصیبتیں جو انہوں نے ہنسی و خوشی برداشت کر لی تھیں دوبارہ ابھر آئیں:

آج سب چوٹیں ابھر آئیں ہیں دل میں ناگہاں
زخم تازہ ہو رہے ہیں کھلتی جاتی ہے زباں
درد کی شدت بنی ہے وقت کی افسانہ خواں
اڑ رہی ہے دامن صبر و سکوں کی دھجیاں
نشتر غم آج پھر پیوست میرے دل میں ہے
پھر وہی پہلی سی ویرانی مری منزل میں ہے

باوجود اس کے کہ شاعر موت کی اٹل سچائی سے واقف ہے لیکن پھر بھی اسے صبر نہیں آتا اور کہتا ہے:

دل کو سمجھاتا ہوں شکوے کا نہیں ہے یہ مقام
ایک دن تو موت لے لیتی ہے اپنا انتقام
پھر بھی کانٹا سا کھٹکتا ہے یہ دل میں صبح و شام
بندۂ ناچیز کی خاطر یہ سارا انتظام
اک جہاں ہے صرف ہنسنے کھیلنے کے واسطے
اور بس میں ہوں مصائب جھیلنے کے واسطے

اس کے بعد کے متعدد بندوں میں زیدؔی نے فلسفۂ غم کو پیش کیا ہے صرف ایک بند بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے:

آنکھ جب کھولی ہے آدم نے تو غم موجود ہے
غم سے آویزش بھی انساں کا مگر مقصود ہے
طاقت سعی و عمل انساں کی لامحدود ہے
دل شکن حالات میں بھی شکوہ نامسعود ہے
مٹ گئے کتنے نظام اس گردش ایام سے
موج مے ابلی ہے پھر بھی بے کسوں کے جام سے

علی جواد زیدؔی ہندوستان کی جنگ آزادی کے مجاہد تھے اور اس سلسلے میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں گو کہ زیدؔی ایک زمیندار خاندان کے فرد تھے۔ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس پر خاندان کے لوگوں نے انہیں بری نظر سے دیکھا اور آخر کار ان کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ سید محمد جواد کوتوال نے زیدؔی کے رشتہ کو قبول کیا اور اپنی بیٹی شہناز بیگم سے عقد کر دیا۔ زیدؔی نے درج ذیل بند میں انکی اس ہمت کی داد دی ہے:

حلقۂ کار اس کا تھا گو دائرہ دربار کا
اور میں رہرو بغاوت کی سیاست زار کا
آبلوں سے تولتا تھا حوصلہ ہر خار کا
اس پہ بھی وہ قدرداں تھا، جذبۂ سرشار کا

جنگ آزادی میں ایسے قدرداں کم کم ملے
اور بزرگوں میں تو جتنے بھی ملے برہم ملے

اگلے دو بندوں میں شاعر ان کی شفقت ومحبت کو یاد کر کے خون کے آنسو روتا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ متوفی کا خلوص ومحبت اور ایثار شاعر کے لئے نا قابل فراموش ہے:

کتنی باتیں ہیں جو دل میں دفن ہو کر رہ گئیں
کتنی یادیں کچھ نئے نشتر چبھو کر رہ گئیں
کتنی امیدیں مری پلکیں بھگو کر رہ گئیں
کتنی فریادیں خموش آنکھوں سے رو کر رہ گئیں
کیسی کیسی حسرتیں تھی جن پر پانی پھر گیا
اک ستارہ جو چمکتا تھا زمیں پر گر گیا

اس کے بعد شاعر نے تین بند میں شہر الہ آباد کو مخاطب کر کے مرثیہ پڑھا ہے۔صرف ایک بند بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے:

اے الہ آباد اے میری بساط آرزو
زندگی کرتی ہے تیرے آب گنگا سے وضو
تجھ سے ہستی کو ملا حسن شفق رنگ نمو
کر سکے گا کیا مرا چاک گریباں بھی رفو
تو نے میرے حال پر آنسو بہایا بھی تو کیا
جانے والا جا چکا میں آج آیا بھی تو کیا

اس کے بعد کے کئی بندوں میں شاعر مرحوم کی دل نشیں یادوں میں کھو جاتا ہے اور ان واقعات کو پیش کرتا ہے جس سے زندگی کے بیش قیمت لمحات کی یادیں وابستہ ہیں:

خانداں اب لفظ بے معنی ہے دنیا کے لئے
خاص ہے رسمی وفاداری اعزا کے لئے
اب تو دامن گیر ہے یہ فکر فردا کے لئے
کر حذر اپنوں سے تکمیل تمنا کے لئے
ہے وہی اپنا جو سیم وزر سے جھولی بھر سکے
کشت دولت خشک ہو جائے تو وہ تر کر سکے

بھائیوں میں امتیاز دولت و افلاس ہے
اب بزرگوں کو نہ خوردوں کو وفا کا پاس ہے
اب وہی اپنے ذوالقربا ہیں جن سے آس ہے
اب سبھی کو بس مفاد ذات کا احساس ہے
اک نئی دنیا بسی ہے اک نیا دور آ گیا
خانداں کے نام کا گلشن جو تھا مرجھا گیا

اس پس منظر میں زیدیؔ ان تمام روایتوں اور قدروں کا ذکر کرتے ہیں جو ہماری قومی اور ملی شناخت تھیں اور آخر کار موت کی سچائی کو قبول کر کے مرثیے کو ختم کر دیتے ہیں:

انتہا شیرازہ بندی کی ہے شاید انتشار
ہیں بہاریں باغ ہستی کی خزاں سے بھی دوچار

زیست برحق اور برحق زیست کا انجام کار
ایک ہی خط پر ہیں ایواں جھونپڑے کنج مزار
غم کے اس ماحول میں کچھ زندہ انساں بھی تو ہیں
آنسوؤں کی چھاؤں میں جینے کے ساماں بھی تو ہیں

علی جواد زیدیؔ نے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر آزاد نظم کی ہیئت میں ۷۷ رمصرعوں پر مشتمل ایک مرثیہ بعنوان 'میرا نام لینے والو' لکھا ہے۔اس مرثیے کی خاص بات یہ ہے کہ مرثیہ کا متکلم شاعر یا کوئی اور نہیں بلکہ خود متوفی ہے، جسے غم والم میں ڈوبے پورے سماج کی بے پناہ محبتوں کا احساس ہے جو اس کے غم میں اس درجہ سوگوار ہے کہ یہ شدت متوفی پر شاق گزرتی ہے کیونکہ متوفی کی زندگی کا مقصد جدید ہندوستانی سماج کو خوشیاں بہم پہونچانا تھا جبکہ یہ پورا سماج رنج وغم میں ڈوب گیا:

جو ہو سکے تو مرا نام بار بار نہ لو
پلک پلک پہ ہیں لرزاں عقیدتوں کے چراغ
یہ سب چراغ کہیں تھرتھرا کے گر نہ پڑیں
یہ مانتا ہوں کہ غم سے مفر نہیں لیکن
ہوائے غم سے کہیں ہر دیا نہ بجھ جائے
ابل رہا ہے جو غم سوگوار آنکھوں سے
یہ غم یہ اشک یہ الفت کا ہدیۂ اخلاص
بہت عزیز بہت محترم مگر یارو
یہ اشک دیکھ کر مجھ کو خوشی نہیں ہوگی

بظاہر ان مصرعوں میں کس مپرسی اور دلجوئی کا رویہ اپنایا گیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھیں تو اس میں غم زدہ لوگوں کے غم کی شدید ترین لہریں موجود ہیں۔ ٹیپ کا یہ مصرع۔ جو ہو سکے تو مرا نام بار بار نہ لو۔ اشارہ ہے غم کی اس شدت کا جو صبر اور ضبط کے حدود سے باہر جا چکا ہے۔ پہلے بند میں غم زدہ سماج کی کیفیت غم کی ترجمانی کے بعد شاعر ماضی کی طرف مراجعت کرتا ہے جہاں متوفی کی اپنے ہم وطنوں سے بے پناہ محبت، اپنائیت اور ایثار و قربانی کی داستان ہے جو قومی موضوعات کو بھی اپنے دائرے میں سمیٹ لیتی ہے:

مجھے تو نام نہیں کام سے محبت تھی
کہ تھا وطن کے زمیں پر غبار صدیوں سے
مرض کا، جہل کا، افلاس کا، غلامی کا
رخ گلاب پر آندھی کی گرد کے مانند
توہمات کے پر ہول و پر خطر سائے
فضائے ملک پر سانپوں کی طرح لہرائے
تعصّبات کے طوفاں، کم آگہی کی وبا
ہر اک دہن میں ہے پیوست آہنی چنگل
قدم قدم پہ ہزاروں کراہتی روحیں
ہر ایک اہل وطن سے سوال کرتی تھیں
کہ سامراج کا یہ ظلم تابہ کے ساتھی
مرے مزاج میں عشرت کا رس بھی تھا لیکن

میں اتنی روحوں کی فریاد سن کے چیخ اٹھا
نہیں نہیں مرے ہوتے یہ ہو نہیں سکتا
جو ہو سکے تو مرا نام بار بار نہ لو

ٹیپ کا یہ مذکورہ مصرع قاری کے دل میں ایک چوٹ کرتا ہے جو غم بھلانے کے برخلاف اس میں شدت پیدا کرتا ہے۔ مرثیہ کا اسلوب بیانیہ ہے اور اس میں خطابت کا شکوہ اور بلند آہنگی نہیں۔ شاعر نے متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے اور یہ متکلم متوفی ہے جس کے مخاطب اہل وطن، عوام اور وہ طبقہ ہے جو جہل، افلاس اور غلامی کا شکار ہیں۔ یہ شعری کردار ایک رہنما لیڈر اور رہبر کی حیثیت سے مخاطبین کے درجہ سے بلند ہو کر ان سے خطاب کرتا ہے۔ لیکن لہجہ میں شان و شکوہ اور بلند آہنگی کے برخلاف شاعر ایک ایسا لہجہ تعمیر کرتا ہے جو نرم مدھم اور پرسوز ہے جس میں محبت اور اپنائیت کے باوصف زیر سطح غم کی شدید لہریں محسوس ہوتی ہیں۔

ان مراثی کے علاوہ دو اور مراثی 'شورش مرحوم' اور 'زندہ ہے احتشام ابھی' زیدی کے سرمایہ شعری میں موجود ہیں۔ آغا شورش مرحوم کاشمیری برصغیر کی معرکہ آرا شخصیتوں میں سے تھے۔ صحافت، خطابت اور شاعری تینوں میدانوں میں انہوں نے اپنے لئے ایک مقام بنالیا تھا۔ زیدی کے شورش سے شدید نظریاتی اختلافات تھے لیکن آزادی اظہار کی راہ میں ان کی قربانیاں اور ابوالکلام پرستی کے زیدی ہمیشہ مداح رہے۔ شعر و شاعری میں انہیں ظفر علی خاں کا تراشیدہ صحافتی انداز پسند تھا۔ زیدی نے یہ مرثیہ بھی اسی انداز میں لکھا ہے:

گزر گیا ہے نہایت خموش طنز کے ساتھ
وہ جس کی فکر پہ حریت خیال کو ناز

وہ اپنا پیر جواں شوق، شورش مرحوم
جو حق کی بات کو بے خوف کر گیا مرقوم

۳۷/اشعار پر مشتمل زیدیؔ کا یہ مرثیہ جہاں شورش کے فکر وفن کی ترجمانی کرتا ہے وہیں ان کی ابوالکلام نوازی، حسرتؔ کا انداز اور مولانا محمد علی جوہرؔ کے طرز تحریر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے:

ابوالکلام کے آداب حریت کا امیں
وہ اور جہاد مسلسل تھے لازم وملزوم
نگارشات میں حسرتؔ کا ولولہ تاباں
رگ قلم میں رواں خون جوہرؔ مرحوم
یہ کم ہے تھا وہ شریک جہاد آزادی
کہ اس جہاد کے رشتے ہیں تا بہ لندن وروم
اذاں دی دشت میں اس نے کوئی سنے نہ سنے
اسی ادا پہ کئی حق پرست جھوم اٹھے جھوم

مرثیے کے آخری دو اشعار میں زیدیؔ نے بے لوث خدمت کرنے والی گذشتہ نسل کے یکے بعد دیگرے دنیا سے چلے جانے کا ماتم کیا ہے۔ شاعر اس بات سے متفکر ہے کی پتہ نہیں اگلی نسل کیسی ہوگی۔ آخری شعر میں شاعر نے دنیا سے اپنی روانگی کو بھی طے بتایا ہے اس لئے کہ شاعر کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز فانی ہے:

وہ نسل ختم ہے پچھلے وفا شعاروں کی
اب اگلی نسل میں کون آئے گا خدا معلوم

اسی طرح کبھی ہم بھی نہ ہونگے اے زیدؔی
کہ ہم بھی آخری منزل میں ہیں ھوالقیوم

علی جواد زیدؔی نے آخری مرثیہ اردو کے مشہور ادیب اور ناقد پروفیسر احتشام حسین کی ناگہانی موت سے متاثر ہوکر کہا ہے۔ احتشام حسین سے زیدؔی کا رشتہ صرف ایک ادیب وشاعر ونقاد کی حیثیت ہی سے نہیں تھا بلکہ احتشام حسین زیدؔی کے عزیز بھی تھے۔ زیدؔی کا یہ مرثیہ غزل کے فارم میں ۴۹/اشعار پر مشتمل ہے جو تین ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ زیدؔی نے مرثیہ کے پہلے حصہ میں بے ثباتی دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف تہذیبوں، واقعوں اور قرآن وحدیث کے مختلف ٹکڑوں کا سہارا لیا ہے۔ زیدؔی نے مرثیے کے ان اشعار میں شعور کی رو کو پیش کیا ہے اور یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ فنا میں بھی ثبات ہے اور موت کے بعد ہی اصل زندگی ہے۔ اس نظریہ کے تحت شاعر کا خیال ہے کہ احتشام جیسا عالم جو مختلف کمالات کا مجموعہ تھا کبھی مرنہیں سکتا اور ہماری نظروں سے اگر وہ اوجھل ہو جائے تو اپنے علم وفضل کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ نظام کائنات کے ہاتھوں احتشام اگر کسی اور دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ مرثیہ کی ابتدا شاعر نے مختلف علامتی، تلمیحاتی اور استعاراتی نظام قائم کرکے کی ہے:

عجب نظام تمنا عجب نظام حیات
کہ ریگزار کے محلوں سے بھی کم ان کو ثبات

شاعر کا خیال ہے کہ اس نظام کائنات میں کسی چیز کو ثبات نہیں اس لئے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ زیدؔی نے مختلف

حوالوں سے منطقی استدلال قائم کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ہر چیز فانی ہے:

ہر ایک شہر میں بکھرے ہوئے قدیم آثار
قدم قدم پہ سجاتے ہوئے ہزار آیات
یہ کہہ رہے ہیں کہ مٹ مٹ گئی ہیں تہذیبیں
قبور ماضی مرحوم ہیں یہ تعمیرات
نمود کیا ہے بجز کل من علیھا فان
کتاب ہر ورق گل میں ہیں رموز وفات

لیکن شاعر یہاں سے ایک فلسفہ پیش کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ سچ ہے کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز فانی ہے لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فنا ہی حقیقت ہے تو حیات کیا ہے اور شاعر کی نظر میں کوئی حادثہ زندگی کے صفات کو چھین نہیں سکتا۔ ذیل کے اشعار زیدیؔ کے فکر و فلسفہ کے بہترین ترجمان ہیں:

مگر فنا ہی حقیقت نہیں حیات بھی ہے
حدوث چھین نہیں سکتا زندگی کے صفات
کوئی تو بات ہے آخر کہ زیست پھر بھی ہے زیست
ہے باوجود حوادث حیات پھر بھی حیات

اس کے بعد شاعر نے حیات کا رشتہ ارشاد خداوندی و نفختہ من روحی سے جوڑ کر حیات انسانی کے ثبات کو روح سے متعلق کیا ہے:

ابھرتے رہتے ہیں مٹ مٹ کے اور کتنے حباب
نئے حبابوں میں ڈھونڈو سمندروں کی حیات

مری زباں پہ ہے شرح خلقتہ من طین
مجھے بتاتے ہو تم کیا رموز ما قد فات
یہ خاک وہ ہے کہ سجدہ کیا فرشتوں نے
تھے نفخ روح میں پنہاں ابد کے چند صفات

حیات انسانی کا اصل دارومدار روح پر ہے اور اسلامی فلسفہ کے مطابق روح کو جسم انسانی میں ڈال کر اللہ دنیا میں انسان کو بھیجتا ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے اور امتحان وآزمائش کا وقت گزر جانے کے بعد انسانی جسم مٹی میں مل جاتا ہے لیکن اس کی روح باقی رہتی ہے اور قیامت کے دن اپنے اعمال کی جزا وسزا پائیگا۔ شاعر نے اس اسلامی فلسفہ کو پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ فنا میں ایک جہت ہے اور زندگی میں لاکھوں جہتیں ہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ چاہے موہن جوداڑو، اجنتا اور ایلورا کی تہذیبیں ہوں یا تاج محل اور نہر سویز جیسے آثار۔ یہ سب زندگی کی علامت ہیں۔ مرثیے کے دوسرے حصہ میں شاعر غم و اندوہ میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے یہ یقین تو ہے کہ احتشام مر نہیں سکتا۔ لیکن شاعر کو احتشام جیسے ادیب، عالم، ناقد اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم انسان سے بچھڑنے کا غم ہے:

عزیز ورو ؤ کی ایسا عزیز چھوٹ گیا
رفیقو یاد کرو اس کے دلنشیں فقرات
ادیبو شاعرو ماتم کرو کہ وہ نہ رہا
کہ جس کی ذات سے روشن تھے فکر کے لمحات

ان اشعار کے بعد شاعر کبھی احتشام کی تنقید نگاری کا ذکر کرتا ہے تو کبھی اس کے خلق ومروت کی داستان سناتا ہے۔ کبھی اسکے طریقۂ خطابت کو یاد کرکے آنسو بہاتا ہے تو

کبھی دوستوں کی محفل کو یاد کر کے روتا ہے اور آخر میں انکے اخلاق و عادات کا ذکر کر کے اس کے وطن اعظم گڑھ کا ذکر کرتا ہے:

وہ نہر ٹونس کا پروردہ ناز گنگ وجمن
طلسم خانۂ شبلی کا مرد خوش اوقات
وہ کلک فطرت علم و ادب کا نقش جمیل
کہ جلوہ گر ہوئے جس میں وسیع معلومات

اور آخر کے تین اشعار میں احتشام حسین کا تعارف بڑے خوبصورت انداز میں کرایا ہے:

ہر اک عقیدۂ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے
دکھائے فہم وعمل کے ہزار امکانات
وہ فلسفی وہ مفکر وہ خوش کلام خطیب
کہ موج گنگ بنا ذکر خشک جدلیات
نگاہ نقد شفیق وعمیق مثل رشید
گواہ اسکے مضامیں گواہ تصنیفات

مندرجہ بالا اشعار میں زیدی نے جتنی خوبصورتی سے احتشام حسین کا تعارف کرایا ہے اس سے احتشام حسین کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ مرثیے کے تیسرے حصہ میں شاعر نے نتیجہ برآمد کیا ہے اور کہا ہے کہ شہید علم وادب تو کبھی مر ہی نہیں سکتا اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گا:

مجھے تو آج فقط ایک بات کہنی تھی
وہی جو میرے دلِ غم زدہ سے نکلی ہے بات

کہ احتشام کے ماتم کے وقت یاد رہے
شہید علم وادب کی تو جاوداں ہے حیات
مری نگاہ میں زندہ ہے احتشام ابھی
صبا ببر زمن خستہ نذر تسلیمات !

علی جواد زیدیؔ اور دیگر اصناف سخن

علی جواد زیدیؔ نے نہ صرف یہ کہ اردو کی مشہور اصناف غزل، نظم اور مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے بلکہ انہوں نے مثنوی، رباعی، قصیدہ، سلام اور نعت و منقبت میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں ذیل میں ان اصناف کے حوالے سے گفتگو کی جارہی ہے۔

(۱) مثنوی

مثنوی اردو ادب کی قدیم ترین صنف ہے اور عہد رفتہ کی مقبول ترین صنف۔ آج بھی مثنویاں کہی جارہی ہیں مگر بہت کم۔ شاعری کی اصطلاح میں مثنوی ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر شعر ہم وزن ہو اور جس میں مطلع کی طرح قافیہ و ردیف کا التزام رکھا گیا ہو۔ مثنوی کے اشعار غیر مردف بھی ہو سکتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک نظم کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک دوسرے سے غیر مربوط ہوتا ہے جبکہ مثنوی کے اشعار میں تسلسل و ربط کا پایا جانا ضروری ہے۔

مثنوی میں عام طور پر کوئی طویل داستان یا قصہ نظم کیا جاتا ہے ویسے اس میں ہر قسم کے موضوعات، مضامین، واقعات یا خیالات مفصل بیان ہو سکتے ہیں اسی لئے اردو تنقید کے باوا آدم خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے اسے شاعری کی سب سے کارآمد اور مفید صنف قرار دیا ہے۔ علی جواد زیدیؔ نے اتر پردیش کے مثنوی نگاروں کا ایک اہم تذکرہ 'مثنوی نگاری' کے نام سے مرتب کیا۔ اس کتاب کا مقدمہ خود ایک

تحقیقی اور تنقیدی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں زیدیؔ نے مثنوی کے منابع اور اسکی ابتدا، مثنوی کے اوزان، مثنوی کے اوزان کی خصوصیات، مثنوی کے اوزان کی توسیع کی تاریخ، مثنوی کے موضوعات اور اجزائے مثنوی وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔مولانا ضیاءالدین اصلاحی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

'تنہا ایک شخص کی تلاش ومحنت سے اس قدر مواد ومعلومات کا اکٹھا ہو جانا اور چھ سو سے زیادہ مثنوی نگاروں کی ہزاروں مثنویوں کا پتہ لگالینا معمولی بات نہیں ہے اور اس کے لئے مصنف کو بڑی محنت وریاضت کرنی پڑی ہوگی۔کتاب کی قدر و قیمت کے لئے مصنف کا نام ہی پوری ضمانت ہے اس سے ان کے ذوق تحقیق وتدقیق، اردو ادب میں بصیرت ودیدہ وری اور تحریر وتصنیف میں پختگی وسلیقہ مندی کا پتہ چلتا ہے۔'

(تبصرہ، مثنوی نگاری: ضیاءالدین اصلاحی: معارف اعظم گڑھ: جون ۱۹۸۶ء)

علی جواد زیدیؔ نے اس تحقیقی کارنامے کے علاوہ خود بھی ایک مثنوی 'مقامات راماین' کے عنوان سے کہی ہے۔علی جواد زیدیؔ جب جنگ آزادی کے سلسلے میں جیل گئے تو جیل ہی میں تلسی داس کی 'رام چرتر مانس' پڑھی اور تحریک کے ایک ساتھی پنڈت بشمبھر دیال ترپاٹھی کی فرمایش پر اس کے بعض مقامات اردو میں نظم کئے۔اس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمے میں مصنف کا کوئی مقصد چھوٹنے نہیں پایا ہے۔مثنوی کے ایک مقام 'داستان گنگا' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

شاہراہ طفلی پہ ہنس کھیل کر　　بڑھ چلے اس من جس عالی گہر
پندرہ سولہ کا ہوا جب کہ سن　　کھیلنے کھانے کے تمنا کے دن

لہو و لعب پر تھی خوشی کی اساس
کھیل لگے کھیلنے دو راز قیاس

ذہن میں آ جائے جو کوئی خیال
پورا نہ ہو جائے بھلا کیا مجال

بیتتے جاتے تھے یونہی ماہ و سال
فکر کہاں اور کہاں راجا کا لال

سرجوندی ہے جو اودھ میں رواں
جس کی طہارت سے ہیں دل شادماں

آب مصفٰی و خنک جس کا ہے
عالم روحانیاں کی کوئی شے

بہتا ہے کس شان سے سوئے شمال
موج ہے یا آئینۂ ماہ و سال

کرنے کو اشنان بڑے چاؤ سے
شہر کے بچے یہاں روز آتے تھے

ایک دن اس من جس طرار سے
کھیل نیا کھیلا نئی طرز سے

دیکھ کے سرجو کا طرب زا بہاؤ
ڈال دی دریا میں بڑی ایک ناؤ

اس پہ سبھی بچوں کو بٹھلا دیا
سیر سے دل بچوں کا گرما دیا

اور سدا کے لئے کھویا انہیں
دامن سرجو میں ڈبویا انہیں

بچوں کی اس مرگ مفاجات کا
شہر میں گھر گھر ہوا ماتم بپا

چوٹ رعایا کے دلوں پر لگی
سب نے پھر اک وفد کی تشکیل کی

راجا سگر جلوا کناں تھے جہاں
وفد گیا نالا کناں، غم نشاں

سر پئے تسلیم کئے سب نے خم
عرض یہ کی شاہ ہیں دل ریش ہم

آپ ہیں پرجا کے مربی مگر
لاڈلا یہ آپ کا خونی پسر

سب کے لئے موت کا پیغام ہے
اب تو ہمارا یہی انجام ہے

رشتہ جو صدیوں کا ہے وہ توڑ دیں
آپ کا یہ دیس اب ہم چھوڑ دیں

آج رعایا کے غم و درد کا
چارہ نہیں ترک وطن کے سوا

آپ کے بیٹے کا بڑا ہے گناہ — کر چکا ہے کتنے ہی کنبے تباہ
کتنے ہی بیٹوں کا کیا اس نے خوں — کیسے ہو بتلایئے دل کو سکوں
آپ کو پیارا ہے دل و جان سے — ہم تو سنیچر ہیں اسے مانتے
سن کے رعایا کی یہ فریاد و آہ — صبر کی تلقین لگے کرنے شاہ
فرض کا احساس بھی ایسا تو ہو — ملک بدر کر دیا فرزند کو (۱)

(۲) سلام

اردو کا ہر وہ شاعر جس نے مرثیے کہے ہیں سلام ضرور کہے ہونگے اور مرثیے کی طرح سلام نے بھی رثائی ادب میں کافی مقبولیت حاصل کی حالانکہ ہمارے ناقدین نے اسکی طرف توجہ نہیں کی۔سب سے پہلے امداد امام اثرؔ نے 'کاشف الحقائق' میں اس صنف پر توجہ دلائی اور اس کے فنی محاسن پر اظہار خیال کیا۔علی جواد زیدیؔ نے انیسؔ صدی کے موقع پر میر انیسؔ کے سلاموں کو یکجا کر کے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا جس میں سلام کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی مختصر مگر جامع تاریخ بھی مرتب کر دی۔انہوں نے اس تفصیلی مقدمے میں سلام کی خصوصیات کو رثائی ادب کے سب سے بڑے شاعر میر انیسؔ کے کلام کے خصوصی حوالے سے تفصیلی مثالیں دے کر پیش کیا ہے۔اس اہم کارنامے پر پاکستان کے مشہور ناقد انتظار حسین نے لکھا:

'سلام کو مرثیہ نگاروں کے یہاں ایک ضمنی حیثیت حاصل رہی ہے ۔مرثیوں کے مرتبین نے بھی اس صنف کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے ۔کسی مرثیہ نگار کے مرثیوں کو مرتب کرتے ہوئے جتنے

۱۔مثنوی نگاری:علی جواد زیدی:نشاط پریس ٹانڈہ:۱۹۸۵ء:ص۲۹۳۔۲۹۲

سلام میسر آئے وہ بیچ بیچ میں شامل کر دیے، باقیوں کے متعلق تردد نہیں کیا۔ میر انیسؔ کے سلاموں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا۔ انیسؔ کے مرتبین کو ان کے جتنے سلام مل سکے وہ انہوں نے مرثیوں کے درمیان چھڑک دیے۔ باقیوں کو تلاش کرنے اور یکجا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'

انتظار حسین نے یہ تبصرہ اپنے مضمون 'سلام کا نشو ونما اردو میں' مشمولہ 'باتیں ملاقاتیں' (مجموعۂ مضامین) میں کیا ہے۔ اس پس منظر میں انیسؔ کے سلاموں کے بارے میں علی جواد زیدیؔ کا یہ مقدمہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ انیسؔ کے سلاموں کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے انہوں نے اس صنف کے نشو ونما اور ارتقاء پر بھی اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ عربی میں تو یہ صنف سرے سے مفقود ہے۔ فارسی میں اکا دکا سلام مل جاتا ہے مگر ان کی معاصرانہ شخصیت ایسی وقیع نہیں۔ اس صنف نے اصل میں اردو میں فروغ پایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو شاعری کے نقادوں نے دوسری مذہبی اصناف کی طرح اس صنف کو بھی توجہ کے قابل نہیں جانا۔

علی جواد زیدیؔ نے نہ صرف یہ کہ انیسؔ کے سلاموں کو مرتب کرنے کا خوشگوار فریضہ انجام دیا بلکہ بذات خود اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ علی جواد زیدیؔ نے اپنے سلاموں کے ذریعہ واقعہ کربلا کو صرف اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے عملی، سماجی، اجتماعی، عوامل ومحرکات کی اہمیت کی طرف بھی نشاندہی کی اور اپنے سلاموں سے بھی وہی کام لیا ہے جو وہ غزل اور نظم سے لیتے رہے ہیں۔ بطور مثال ان کے ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اس دار فنا میں جو بقا مانگ رہا ہے گھاٹے کا یہ سودا ہے وہ کیا مانگ رہا ہے
اُحمد نہیں کرتے ہیں طلب اجر رسالت قرآن کی لفظیں ہیں خدا مانگ رہا ہے
ارمان شہادت کا وہ منظر شب عاشور دیکھا جسے مرنے کی دعا مانگ رہا ہے
بڑھ جذبۂ ایثار حسینی کہ زمانہ زخم دل دوراں کی دوا مانگ رہا ہے
تھراتے ہیں تاریخ کے لب داد شجاعت بے شیر کا ننھا سا گلا مانگ رہا ہے
بیٹے کی طرح شہ نے جسے پیار سے پالا وہ بھائی بھی مرنے کی رضا مانگ رہا ہے

زیدیؔ نہ ہو خاموش کہ خوابیدہ ہے منزل
ہر قافلہ اک بانگِ درا مانگ رہا ہے

(۳) رباعی

رباعی عربی لفظ ربع سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی ایک مختصر مگر مشکل ترین صنف نظم ہے۔ جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ رباعی گو شاعر کو صرف چار مصرعوں میں فکر و خیال کے اعتبار سے، ایک مکمل مضمون پیش کرنا ہوتا ہے۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور تیسرے مصرعے میں قافیے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

رباعی مشرقی ادب کی مقبول صنف سخن ہے۔ عربی سے مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی فارسی کی وساطت سے جب اردو میں آئی تو اس کا نام ترانہ تھا اور بعد میں اس کا نام دوبیتی ہوا۔ اردو کے دوسرے اصناف سخن کی طرح یہ صنف بھی اصلاً بیرونی ہے لیکن اس کی ملتی جلتی صنف خود ہندوستان میں بھی موجود تھی۔ سنسکرت کے چار چرن،

ہندی کی چوپائی اور پشتو کی چار بیتیہ کا بنیادی ڈھانچہ چند اختلافات کے باوجود رباعی سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ ویسے انگریزی 'کوآٹرین' بھی ملتی جلتی صنف ہے لیکن ان مماثلتوں کے قطع نظر عروضی ہیئت میں مصرعوں کی تعداد اور قوافی وردیف ہی کو نہیں بلکہ بحر کو بھی بڑا دخل ہے اور یہ سب مل کر ہی ہیئت کا اجتماعی آہنگ مقرر کرتے ہیں۔ عروضیوں نے رباعی کے چوبیس اوزان مقرر کئے ہیں اور سب کے سب بحر ہزج سے مخصوص ہیں۔ اس کی دو شاخیں ہیں ہزج اخرم اور ہزج اخرب۔ رباعی کے چار مصرعے ان میں سے کسی ایک وزن میں لکھے جاتے ہیں یعنی اس کے تمام مصرعے ایک مخصوص بحر میں ہوتے ہیں 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' سے اس کی بحر کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ رباعی کا ہر مصرع اسی وزن پر ہو۔ اس وزن کے علاوہ رباعی کے دوسرے اوزان بھی ہیں۔ مقررہ اوزان اور اس کے فروعات میں سے کسی وزن میں ہو تو یہ رباعی ہوگی ورنہ چار مصرعوں کی پابندی کے باوجود یہ قطعہ ہو جائے گا یا دوبیتی کہلائے گا۔ اگر پہلے دو مصرعوں میں ایک اور دوسرے دو مصرعوں میں دوسرا مضمون ہو تو آہنگ کے اعتبار سے وہ غزل کے اشعار ہونگے اور عروضی ہیئت کی پابندی کے باوجود رباعی کہلانے کے مستحق نہ ہونگے۔ علی جواد زیدی نے 'رباعیات انیس' کے مقدمہ میں لکھا:

> 'لہجہ کہیں حکیمانہ ہوگا تو کہیں عارفانہ، کہیں راویانہ ہوگا تو کہیں مبصرانہ۔ رہا اختصار تو غزل کے شعر میں بھی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں رباعی میں خارجی اور داخلی آہنگوں کا امتزاج زیادہ نمایاں ہے۔ رباعی میں دو اشعار اور اوزان کی قید اور ایجاز و اتحاد تاثر سے ایک خصوصی آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور یہی رباعی کو

دوسرے اصناف سے ممیّز کرتا ہے۔

علی جواد زیدیؔ کے مطابق گویا رباعی میں مضمون درجہ بہ درجہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے اور آخری مصرع انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لئے کہ اس میں ابتدائی مصرعوں کا نچوڑ چوتھے مصرعے میں بے ساختگی کے ساتھ اس طرح ادا کرنا ہوتا ہے کہ انسان بے ساختہ واہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ بات سب شاعروں کے مقدر میں نہیں آتی۔ یہ صنف نہایت مشق و ریاض کے بعد ہی اپنے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور کثرت مشق و ریاض کے بعد ہی رباعی گو شاعر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

علی جواد زیدیؔ نے اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق اردو رباعی کے سب سے بڑے شاعر انیسؔ کی رباعیوں کو یکجا کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا اور نہ صرف یہ کہ انیسؔ کی رباعیوں کو یکجا کیا بلکہ اس پر ایک تفصیلی مقدمہ بھی قلم بند کیا جس میں انہوں نے رباعی کے آغاز و ارتقا، اس کی خصوصیات اور میر انیسؔ کے رباعی کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں پر علی جواد زیدیؔ نے انیسؔ کے پیش رو اور ان کے معاصرین کی رباعیوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے انیسؔ کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ انیسؔ کی رباعیاں موضوعات کے اعتبار سے مختلف النوع حیثیت رکھتی ہے لیکن زیادہ تر رباعیاں رباعی کی ایک ضمنی صنف رثائی رباعیوں کو ہی محیط ہیں اور انہیں رباعیوں کو انیسؔ نے اپنا خاص موضوع بنایا ہے اس لئے کہ یہ رباعیاں انیسؔ نے مجلسوں کے لئے لکھی تھیں جو مرثیے سے پہلے سامعین کے سامنے پیش کرتے تھے۔ انہوں نے فخریہ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ جو رباعی کے میدان میں ایک اہم اضافہ ہے۔ رباعی کا اصل میدان چونکہ اخلاق و حکمت کے مضامین عالیہ کو شعری

قالب میں ڈھالنا ہے اور کورے وعظ و پند کی سطح سے بلند ہو کر آفاقی حیثیت سے اس میں لطافت پیدا کرنا ہے، اس لئے ان کا میدان بیحد مشکل اور دشوار گذار ہے اگر چہ یہ دیکھنے میں بظاہر سادہ اور بے نشیب و فراز معلوم ہوتا ہے۔ انیسؔ نے اخلاقی رباعیوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ کافی وسیع، متنوع اور ادبی اعتبار سے بہت ہی بلند پایہ ہے۔

علی جواد زیدیؔ نے نہ صرف یہ کہ اردو کے اس عظیم شاعر کے شعری سرمائے کو محفوظ و منضبط کیا بلکہ اپنے وسیع ادبی مطالعے اور کثرت مشق کی بنا پر اس فن کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی مکمل صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے کچھ رباعیاں بھی کہی ہیں جن میں زمانے سے آنکھیں ملا کر چلنے کا جذبہ ہے اور عزم و حوصلہ کا درس بھی۔ زیدیؔ کی رباعیوں کے مطالعے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی رباعیوں میں وقت اور زمانے کے نامساعد حالات کی ترجمانی کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جرأت، ہمت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ زمانے سے نبرد آزما ہونے کا سبق بھی دیتی ہیں۔ چند رباعیاں بطور مثال پیش کی جا رہی ہیں:

دل اوب گیا خموش رہتے رہتے　　دم گھٹنے لگا رنج سہتے سہتے
ایک جام ادھر ہاتھ بڑھا کر ساقی　　اغیار سے کوئی بات کہتے کہتے

☆

تخلیق سے جام شعر بھرتا ہوں
خاروں سے گلوں کی بات کرتا ہوں
اغیار کی تنقید تو ہیں دعوت فکر
تحسین سے دوستوں کی ڈرتا ہوں

شاعر ہے خموش کس سے بولے آخر　　راز دل فکر کس پہ کھولے آخر
تنہائی میں اور تو نہیں کچھ ممکن　　پلکوں ہی پہ موتی کوئی تولے آخر

☆

گونجی ہوئی یوں نوائے آزادی ہے　　جھلسے ہوئے لب پہ نغمۂ شادی ہے
آثار قدیمہ کے سے پس منظر میں　　اے دشمنو! آؤ جشن آزادی ہے

☆

دل سے مری یاد تم مٹاتے ہوگے　　لیکن کیا یہ بھی بھول جاتے ہوگے
ساز غم پہ کبھی سنا تھا ہم نے　　وہ نغمہ جواب بھی گنگناتے ہوگے

☆

سرگشتۂ بادۂ قیادت ہوں میں　　اپنے لئے آپ ہی ایک آفت ہوں میں
ہے جنت گمشدہ وراثت میری　　سرتابہ قدم زوال صورت ہوں میں

☆

بیتے ہوئے دن کی یاد جانے بھی دو　　شمع سر راہ باد جانے بھی دو
تم کو میرے غم کی فکر کیوں ہے اتنی　　منھ مانگی تھی یہ مراد جانے بھی دو

☆

امعان نظر سے جب بھی دیکھا زیدیؔ
میں کہہ نہ سکا جہاں کو دھوکا زیدیؔ
کل چاند کی رفعت سے جو جھانکا جا کر
کچھ بڑھ گیا اور حسن دنیا زیدیؔ

(۴)قصیدہ ، نعت اور منقبت

قصیدہ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی کی تعریف یا ہجو کی جائے ۔ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنی کتاب 'اردو میں قصیدہ نگاری' میں قصیدہ کے لغوی معنی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔اصطلاح میں قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوں اور جس میں مدح یا ذم، وعظ ونصیحت یا مختلف کیفیات وحالات وغیرہ کا بیان ہو۔

قصیدہ اردو کی مقبول ترین صنف سخن تھی ۔ عام طور پر قصیدے بادشاہوں، وزیروں ، امیروں اور بزرگان دین کی مدح میں لکھے جاتے تھے۔مگر شہنشاہیت کے زوال کے بعد قصیدے صرف انبیائے کرام ، ائمۂ معصومین ، صحابہ کرام اور بزرگان دین کی شان میں کہے جاتے ہیں اور اسی قصیدے کو منقبت یا منقبتی قصیدہ بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اب امراء ونوابین کا دور دورا نہیں ہے اس لئے قصیدہ کی مقبولیت کم ہوگئی اور اب قصیدے صرف مذہبی اعتقاد کی وجہ سے کہے جاتے ہیں۔علی جواد زیدیؔ نے بھی کسی امیر و بادشاہ کی مدح سرائی نہ کر کے ائمہ طاہرین کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔

زیدیؔ کو قصیدے سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے اور اس سلسلے میں ان کی کتاب ' قصیدہ نگاران اتر پردیش' خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ بظاہر یہ اتر پردیش کے قصیدہ نگاروں کا تذکرہ ہے لیکن زیدی نے اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق یہاں بھی داد تحسین حاصل کی ہے۔اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو میں امراء ونوابین کی مدح سرائی

سے کہیں زیادہ نعتیہ اور منقبتی قصائد لکھے گئے ہیں اور ہمارے ناقدین حقائق سے بے نیاز ہوکر جو جھوٹی مدح سرائی کا الزام لگایا کرتے ہیں وہ ان کے عدم مطالعہ پر مبنی ہے۔ دراصل ہمارے ناقدین نے مذہبی ادب کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اس لئے قصیدہ نگاری سے متعلق ان کا تصور ناقص اور گمراہ کن ہے۔

نعت نگاری پر بھی ان کی مخصوص توجہ رہی ہے۔کئی مضامین کے ساتھ ساتھ سلسلہ اتر پردیش کی ایک کڑی 'نعت نگاری' کے نام سے مرتب کی ہے اور ان کی اس کوشش سے اتر پردیش کے کوئی ایک ہزار سے زائد نعت نگاروں کا سراغ ملا اور ان کے نمونہ ہائے کلام یکجا ہوگئے۔اس میں انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ نعت نگاروں کا مجمع خاصا گنگا جمنی ہے اور اس میں مختلف عقائد و مسالک کے شعرا نے حصہ لیا ہے۔

واضح ہو کہ علی جواد زیدیؔ نے صنف قصیدہ سے ہی سے اپنی شاعری کی ابتدا کی تھی اور ان کا سب سے پہلا قصیدہ جون پور کے ایک ہفتہ وار اخبار 'المصطفیٰ' میں ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا لیکن اب وہ نایاب ہے۔ایک دوسرے نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار یہاں پیش کئے جا رہے ہیں:

فخر ہے جس پہ محبت کو وہ محبوب الہٰ
جس پہ نازاں ہے حقیقت وہ حقیقت آگاہ
وہ شجاعت کہ اگر دیکھ لی صورت اک بار
دشمن امن نے پائی نہ ہزیمت کی بھی راہ
خواہش نفس کے ماتحت کبھی بات نہ کی
اس صداقت پہ ہے قرآن کے آیات گواہ

احد و خیبر و خندق بھی گواہی دیں گے
ان سے ٹکرانے جو آئے گا وہ خود ہوگا تباہ

ایک دوسرا قصیدہ جو مولائے کائنات حضرت علیؑ کی مدح میں ہے اس کے درج ذیل اشعار قابل دید ہیں:

شیر ازہ بند ملت اسلام ہیں علیؑ
ان سے بڑھی ہے عظمت تیغ ہلال اور
ان کی ولا نے ایک لڑی میں پرو دیا
تھے ورنہ شرق و غرب و جنوب و شمال اور
ممتاز یوں بھی تھا بنی ہاشم کا گھر مگر
نکھرے علیؑ کی ذات سے کچھ خط و خال اور
چپ رہنے کے سوا نہ ملے گا کوئی جواب
اس طرح کے ہزار کرو تم سوال اور
تاریخ کے ورق کو پلٹ کر بھی دیکھ لو
ملتی نہیں ہے شیر خدا کی مثال اور

علی جواد زیدیؔ نے ایک طویل قصیدہ 'عزم حسینی' کے عنوان سے لکھا تھا۔ طویل قصیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ تشبیب بھی طویل تھی۔ حضرت امام حسینؑ کی مدح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اس کا وجود پاک مکرم، اس سے نمود بزم دو عالم
زخم جبین وقت کا مرہم، اس کا تلاطم خیز فسانہ

یہ سردار شباب جنت، منصوص اس کی شان طہارت
کس کو بھلا ہے شک کی ہمت، ان ہوالا وحی یوحیٰ
علم و شجاعت کا یہ سنگم، مثل کوہِ گراں مستحکم
ٹل نہیں سکتا عزم مصمم، اک تاریخ ہے اس کا ارادہ
عالم گیر ہو جب بیچینی، بڑھتا ہے آگے عزم حسینی
آج تک اس کو روک نہ پایا، آگ کا دریا خون کا دھارا

علی جواد زیدیؔ کے اعتقادی ادب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اس لئے کہ وہ جس ماحول کے پروردہ تھے وہاں پر عربی و فارسی کا عام چلن تھا۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں عربی و فارسی تراکیب کا بہترین استعمال بھی ملتا ہے۔ بعض جگہوں پر وہ اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے پوری پوری قرآنی آیات کو بھی نظم کر دیتے ہیں۔ زیدیؔ کے یہاں یہ اثرات ان کے کثیر مطالعہ اور قرآن وحدیث اور تاریخ سے گہری وابستگی کی بنا پر ہے۔

اختتامیہ

(علی جواد زیدیؔ کی شاعری کا مجموعی محاکمہ)

گذشتہ سطور میں علی جواد زیدیؔ کی شاعرانہ خدمات کا قدرے تفصیل سے محاکمہ کیا جا چکا ہے۔ زیدیؔ کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ کہا غلط نہ ہوگا کہ زیدیؔ کی شاعری بیسویں صدی کے ان تاریخی واقعات وحالات سے پردہ اٹھاتی ہے جو ابھی تک صیغۂ راز میں تھے۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی انداز بھی ہے، ترقی پسندی کی ترجمانی بھی اور دور جدید کے مسائل کی عکاسی بھی۔

علی جواد زیدیؔ نے غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، سلام، نعت ومنقبت ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان نظم ہے اور اس کے بعد غزل۔ زیدیؔ نے اس وقت شاعری شروع کی جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ ابتدا میں انہوں نے کچھ غزلیں بھی کہی تھیں لیکن وہ غزل کی افادیت کے اتنے منکر ہوئے کہ انہوں نے اپنا دیوان ہی نذر آتش کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ غزل موجودہ عہد کے مسائل کو پیش کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ لیکن انہوں نے غزل کی افادیت سے بالکل ہی انکار نہیں کیا۔ وہ کلاسیکی ادب اور اس کی افادیت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعد میں غزلیں کہنا شروع کیں اور بہت سی کامیاب غزلیں کہی ہیں

علی جواد زیدیؔ اپنی غزلوں میں مترنم لہجہ کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا کلاسیکی مطالعہ نہایت وسیع ہے اور روایت سے اسی وابستگی کی بناء پر وہ مسائل کے

اظہار کے لئے علامتوں، استعاروں، کنایوں اور تشبیہوں کا استعمال کرتے ہیں۔ان کا خیال کہ اگر غزل میں علامت و استعارہ سے کنارا کشی اختیار کی گئی تو معنویت کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ زیدیؔ نے پرانی علامتوں کو جدید طریقے سے پیش کیا ہے۔ اور ان پرانی علامتوں میں نئی معنویت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ای۔ اے حیدریؔ اپنے ''مضمون نئی غزل کا مزاج ومیلان'' میں زیدیؔ کی شاعری کے تعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''علی جواد زیدیؔ بہت تیزی سے فنی ارتقاء کی منزلیں طے کر رہے ہیں اور نہ صرف نظموں بلکہ غزلوں میں بھی عصری حسیت، بے یقینی وعدم تحفظ اور نا آسودگی ومحرومی وغیرہ موضوعات کو مثبت انداز میں رمزیت و ایمائیت اور علامت و استعارے کے پیرائے میں پیش کررہے ہیں''۔(۱)

علی جواد زیدیؔ نے ابتدا میں رومانوی طرز کی شاعری کی ہے چونکہ زیدیؔ کا اصل میدان نظم گوئی ہے۔اس لیے رومانوی دور سے نکلنے کے بعد بیشتر اہم سماجی، سیاسی ومعاشی مسائل پر کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔اور آزادی سے پہلے تک تو ان کا میدان صرف نظم ہی تھا لیکن ان نظموں میں بھی جدید عناصر کے دوش بدوش کلاسیکی عناصر موجود ہیں اس لئے کہ وہ فنی سطح پر کلاسیکیت کی عظمت کے معرف ہیں اور ضرورت پر اس کے استعمال کو عیب نہیں خیال کرتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ہندی اور فارسی عناصر کا بہترین استعمال موجود ہے۔ زیدیؔ نے بہت سے

۱؎ نئی غزل کا مزاج ومیلان: مشمولہ'افکار ونظریات': ای اے۔حیدریؔ: ناشر مصنف صفحہ ۵۵

بیرون ملک کے سفر بھی کئے جس سے ان کے تصورات میں وسعت ، خوبصورتی ، توانائی اور سلیقۂ اظہار میں جدت پیدا ہوئی ہے۔ زیدیؔ نے اس وقت شاعری شروع کی تھی جب ہندوستان کی جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ اسی لئے زیدیؔ کی زیادہ تر نظمیں آزادی کے موضوعات پر ملیں گی۔ ان میں بہت کم ایسی ہوں گی جو دوسرے موضوعات پر ہوں۔ ان کی نظموں میں آزادی اور آزادی سے متعلق مسائل نیز عہد حاضر میں مزدوروں ،نوجوانوں اور طالب علموں کے مسائل اور ان کے حل کی ترجمانی موجود ہے۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں تو وہ علمی طور پر شریک رہے اور جیل بھی گئے۔ کئی مرتبہ لاٹھیاں بھی کھانی پڑیں۔ اس لیے کہ وہ صرف شاعری نہیں ایک سپاہی بھی تھے۔ زیدیؔ نے روایتی اور پابند قسم کی نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ آزاد نظمیں بھی کہی ہیں جس میں ''ہولی اور لاش'' ان کی میاب ترین نظمیں ہیں۔ ''لاش' کے بارے میں اردو و فارسی کے مشہور شاعر اقبال احمد سہیلؔ نے کہا:

''اگر نئے شعراء ایسی آزاد نظمیں لکھیں تو مجھے آزاد نظم سے کوئی بیر نہیں''۔(۱)

آزادی کے بعد زیدیؔ نے ہیئت اور تکنیک کے کچھ کامیاب تجربے کئے اور قدیم علامتوں اور استعاروں کو نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا۔

زیدیؔ نے غزل اور نظم کے علاوہ مثنوی ، رباعی ،قصیدہ ،نعت و منقبت و مرثیہ وسلام وغیرہ بھی کہے ہیں۔ مثنوی کے میدان میں ان کی کتاب 'مثنوی نگاری' ایک تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک تحقیقی کتاب کی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ زیدیؔ

۱ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۱۲۰

نے تلسی داس کی ''رام چرتر مانس'' کا اردو ترجمہ ''مقامات رامائن'' کے نام سے کیا ہے۔اس میں زیدیؔ نے یہ خصوصیت باقی رکھی ہے کہ ترجمہ میں مصنف کا اصل مقصد نہیں چھوٹنے پایا ہے۔

زیدیؔ نے بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔انہوں نے اپنی رباعیوں سے وہی کام لیا ہے جو غزلوں اور نظموں کا محور ہے۔رباعیوں میں موجودہ عہد کے مسائل پر بڑے خوبصورت انداز میں طنز کیا ہے۔

زیدیؔ نے نعتیہ اور منقبتی قصائد بھی کہے ہیں۔نعت اور قصیدہ پر ان کی کتاب 'نعت نگاری'' اور قصیدہ نگاران اتر پردیش'' اہمیت کی حامل ہے .....

زیدیؔ نے نعت نگاری میں یہ ثابت کیا ہے کہ نعت گویوں کا اچھا خاصا مجمع گنگا جمنی ہے۔''قصیدہ نگاران اتر پردیش'' بظاہر اتر پردیش کے قصیدہ نگاروں کا تذکرہ ہے۔ لیکن زیدیؔ نے یہاں بھی داد تحقیق حاصل کی ہے۔اور یہ کہا ہے کہ ہمارے ناقدین قصیدہ نگاروں پر جو جھوٹی مدح سرائی کا الزام لگاتے ہیں وہ عدم مطالعہ پر مبنی ہے۔ ہمارے ادب میں امراء ونوابین کی مدح میں قصیدوں سے زیادہ رسولؐ اکرم،ائمہ طاہرین اور بزرگان دین کی شان میں قصیدے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ زیدیؔ نے شاعری ہی سے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی اور عام طور پر لوگ انہیں ایک شاعر ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔انہوں نے بہت پہلے ہی مشاعروں میں جانا ترک کر دیا تھا۔نجی صحبتوں میں بھی شاذ و نادر ہی کلام سناتے تھے۔کبھی کبھی لکھتے اور چھپواتے رہتے تھے۔وہ خواہ مخواہ شاعری کا لبادہ اوڑھنے کو پسند نہیں کرتے۔ان کا شعری ذخیرہ باوزن اور وقیع ہے اور بہت سے ناقدین نے اسے

پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بالخصوص ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں ان کا جیسا متوازن لہجہ اور شعری آہنگ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوا۔ جدت پسندی کے دور میں بھی وہ اپنے آپ کو لئے دیئے رہے اور بعض اچھی نظموں اور غزلوں سے نوازا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کے اکتسابات سے صرف نظر کرنا ادبی دیانت داری کے اصول کی خلاف ورزی ہے۔ زیدیؔ کی شاعری قدیم و جدید رجحانات کا حسین امتزاج ہے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری میں نئی فکر ہے، تجدد ہے اور انحراف کی ہمت ہے۔

زیدیؔ کی شاعرانہ خدمات کے اس اعتراف کے باوجود بڑے افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ بیشتر ترقی پسند ناقدین اور ادیبوں نے زیدیؔ کو نظر انداز کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زیدیؔ کسی خاص گروہ کے زیر اثر نہیں رہے اور ادب میں پارٹی لائن کی سخت مخالفت کرتے رہے۔ وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ایک شاعر، ایک محقق، ایک ادیب کی حیثیت سے نہیں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنی عظمت کا احساس ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن کسی بالغ نظر کے لئے یہ ممکن نہیں:

صلح کرنا تو زمانے سے ہے آساں لیکن
مجھ کو زیدیؔ مری بالغ نظری نے مارا

لیکن اس کے باوجود زیدیؔ کی بعض ناقدین اور ادیبوں نے قدر کی ہے اور ان کی شاعری کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے ان کی شاعری پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہیں:

''شاعری فنی حیثیت سے اثر پیدا کرنے کے لئے جو مطالبے

کرتی ہے جواد زیدیؔ اسے بڑی خوبی سے پورا کرتے ہیں۔ وہ مواد اور صورت کے اس امتزاج کو ملحوظ رکھتے ہیں جہاں دونوں مل کر مکمل فنی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انہیں انداز بیان پر قدرت ہے۔ ہندی اور فارسی الفاظ یکساں لطافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تقریباً ہر نظم میں ایک نوع کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ترنم کا احساس رکھنے کی وجہ سے ان کی ہر قسم کی نظموں میں بڑی روانی پائی جاتی ہے''۔(۱)

محمد علی صدیقی 'تیشۂ آواز' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علی جواد زیدیؔ نے اس مجموعۂ کلام میں منفرد اسلوب شاعری کے ساتھ ایک ایسی طرز کی تمثال سازی کا مظاہرہ کیا ہے جو ترقی پسند شعراء میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ یہ وہ وصف خاص ہے جو صرف ان شعراء میں نظر آتا ہے جو اجتماعی تقاضوں اور انفرادی میلان کے مابین گہری مطابقت پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں''۔(۲)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے علی جواد زیدیؔ کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''علی جواد زیدی نے اردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس کے ساتھ ہندی ادب سے ان کو بہت لگاؤ ہے۔ یہی وجہ

---

۱ تعارف رگ سنگ: سید احتشام حسین صفحہ ۲۴

۲ تبصرہ بر تیشۂ آواز: مطبوعہ ماہ نامہ افکار کراچی جنوری ۱۹۸۶ء

ہے کہ ان کی شاعری میں ابتدا ہی سے ایک رسیلا پن اور نرم
و مانوس انداز ہے۔ان کی نظموں میں بھی گھن گرج کے بجائے
گیتوں کا بہاؤ اور گھلاوٹ ہے''۔(۱)

ممتاز نقاد آل احمد سرورؔ نے زیدیؔ کی شاعری سے متعلق یہ رائے پیش کی ہے:

''علی جواد زیدیؔ اردو کے مشہور شاعر اور مسلمہ صلاحیتوں کے
مالک ادیب ہیں انہوں نے غیر معمولی ادبی اہلیتوں کا مظاہرہ کیا
ہے۔جن لوگوں نے اردو ادب کو نئی قدروں اور رجحانوں سے
آشنا کرایا ہے ان کی صف میں زیدیؔ نے اپنے لئے نمایاں جگہ
بنالی ہے۔''(۲)

فراقؔ گورکھپوری جذبیؔ اور زیدیؔ کے مجموعہائے کلام کے بارے میں اپنی کتاب ''اردو کی عشقیہ شاعری'' میں لکھتے ہیں:

''جذبیؔ اور زیدیؔ کے مجموعے ''فروزاں اور زہراب'' کے نام سے
نکلے اور فرسودگی، رسمیت اور باسی پن کے عیب سے بالکل پاک
تھے۔دونوں ایک طرح کے شاعر نہیں ہیں اپنی الگ الگ شخصیت
رکھتے ہیں لیکن اس دور کے نمائندہ دونوں ہیں۔''(۳)

محمود ایازؔ زیدیؔ کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

---

۱ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۱۲۰

۲ آل احمد سرور: انتخاب علی جواد زیدی! تعارف: ۱۹۷۱ء

۳ اردو کی عشقیہ شاعری: فراقؔ گورکھپوری: ۱۹۴

''زیدیؔ صاحب ترقی پسندوں کے ہراول دستہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اردو کے جن ادیبوں نے ۱۹۳۶ء کے بعد اپنے خون جگر سے فن وادب کی آبیاری کی ہے ان میں زیدیؔ صاحب کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے''۔(۱)

پروفیسر محمد حسن نے زیدیؔ کی شاعری سے متعلق اپنے مضمون ''زیدی کا شعری مزاج''مشمولہ ''ضبط شدہ نظمیں''میں یہ رائے پیش کی ہے:

''علی جواد زیدیؔ کی شاعری جنوں کی نہیں ہوش کی شاعری ہے.....جواد زیدیؔ کا سارا کلام شائستگی اور شعور،روایت کے احترام اور بدلتے ہوئے سماج کے ادراک کا حسین اور دلفریب امتزاج ہے''۔(۲)

ڈاکٹر خلیق انجمؔ نے زیدیؔ کے مجموعہ ''سلسلہ'' کے آغاز میں زیدیؔ کی شاعری سے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عصری زندگی کے گہرے شعور،عصری آگہی،انسانی تاریخ سے غیر معمولی واقفیت اور اظہار پر پوری قدرت نے ان کی نظموں کو توانائی بخشی ہے اور انسان دوستی،دردمندی،بصیرت اور متحرک ذہن نے ان کی شاعری میں خلوص اور اپنائیت کی گرمی پیدا کردی ہے''۔(۳)

---

۱ محمود ایاز،ایک خود کلامی:روزنامہ سالار بنگلور ۵/مارچ ۱۹۶۵ء

۲ زیدیؔ کا شعری مزاج:پروفیسر محمد حسن:مشمولہ ضبط شدہ نظمیں صفحہ ۳۰۔۲۹

۳ حرف آغاز:سلسلہ:علی جواد زیدیؔ صفحہ ۸۔

پاکستان کے استاد شاعر اور عالم دین مولانا مظفر حسین ظفرؔ نے زیدیؔ کے دو مجموعہائے کلام ''نسیم دشت آزرو'' اور ''تیشۂ آواز'' کی وصولی پر شکریہ کے خط میں ان کی شعری قدر و قیمت کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''شکریہ کہ آپ نے ایسی زندگی سے بھرپور کتابیں بھجوائیں۔ پڑھتا ہوں، پھر پڑھتا ہوں۔ سیری نہیں ہوتی۔ آپ کو اظہار فی الضمیر پر جو قدرت ہے وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ہر ہر لفظ پر آپ کو داد ملنی چاہیے۔ یوں تو دونوں ہی کتابیں آپ کی انفرادیت کی آئینہ دار ہیں۔ آپ کی غزلوں میں بھی ہلکا سا پرتو نظم کا جھلکتا ہے.... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر آپ کو فیضؔ جیسی شہرت کیوں نصیب نہ ہوئی۔ فکر کی گہرائی اور تمثیل کی گیرائی میں آپ کا مرتبہ ان سے کم نہیں البتہ سوز و گداز اور لہجے کی نرمی میں وہ آپ سے آگے ہیں۔''(۱)

محمد ایوب واقفؔ نے اپنے مضمون ''علی جواد زیدیؔ: شخصیت اور فن'' میں علی جواد زیدیؔ کی شاعری کے تعلق لکھا ہے:

''ان کی نظموں اور غزلوں میں زبان و بیان کی پختہ کاری، دلکش انداز، تخیل اور سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں واردات حسن و عشق کی نیرنگیاں بھی ہیں اور اجتماعی زندگی کے معاملات مسائل کی عکاسی بھی۔ اپنے کلام کے بیشتر حصے میں

۱ مظفر حسین ظفرؔ: ایک ذاتی خط بنام علی جواد زیدیؔ: ۲۲؍جنوری ۱۹۸۶ء

انہوں نے ذاتی معاملات اور شخصی واردات سے وسیع ہوکر عام
انسانی معاملات ومسائل پر فکر کی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں
قدیم وجدید رنگ سخن کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔''(۱)

آخر میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے اعتراف سے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں جو ایک بزرگ ادیب نے اس عہد کے ایک نوجوان شاعر کے تعلق سے کیا ہے۔'ملک ادب کے شہزادے' کے درج ذیل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''ان کی شاعری میں لذت ہے، ایک ابھار بھی ہے، مفہوم کو
اچھے کنائے سے ذہن نشین کرتے ہیں۔اس لئے کلام میں
خلوص بھی ہے اور زور بھی۔مجھے جو بات سب سے زیادہ ان کی
شاعری میں پسند آئی وہ ان کی نظموں کا تسلسل اور اشعار میں
مفہوم کی وضاحت ہے۔گویا طرز بیان میں ایک ندرت ہے جو
پوری شاعری کو دلکش بنا دیتی ہے۔''(۲)

درج بالا آراء اعترافات اور خراج تحسین کے باوجود ضرورت اس بات کی ہے کہ علی جواد زیدیؔ کی ادبی اور شعری خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔تاکہ اردو ادب میں انہیں ان کا جائز مقام مل سکے۔

---

۱ محمد ایوب واقفؔ:علی جواد زیدی،شخصیت اور فن:ماہنامہ شاعر بمبئی اپریل ۱۹۷۱ء

۲ ملک ادب کے شہزادے:ڈاکٹر سید اعجاز حسین:کارواں پبلشرز الہ آباد:۱۹۵۴ء

علی جواد زیدیؔ سے ایک گفتگو

پدم شری علی جواد زیدی مرحوم تجربات و مشاهدات کا بیش بها سرمایه تهے۔ انتقال (٦/دسمبر ٢٠٠٤ء) سے کچھ مهینے پهلے راقم الحروف نے طلبا کی سیاست کو مد نظر رکھتے هوئے مرحوم سے بالمشافه گفتگو کی تهی جسے نذر قارئین کیا جارها هے۔

عابد: آپ شاعر، نقاد، صحافی کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ آپ ہی نے حکومت اتر پردیش کے ترجمان 'نیا دور' کا آغاز کیا اس سلسلے میں کچھ بتائیں؟

زیدی: جب میں ۱۹۴۶ء میں سیکشن انچارج اردو کی حیثیت سے انفارمیشن میں آیا (پہلے یہ ہوم ڈپارٹمنٹ کا ایک سیکشن تھا) تو اطلاعات کے نام سے بغیر ایڈٹ ہوئے پریس نوٹ کے ترجمہ شائع کر دیئے جاتے تھے میں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں تبدیلی ہونا چاہئے۔ اسی خیال کے تحت غلام احمد فرقتؔ اور شمیمؔ کرہانی سے کہا کہ اپنی تخلیقات چھاپنے کے لئے دیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی تخلیقات چھپی اور ادبی حلقوں میں اس تبدیلی کو پسند کیا گیا۔ چنانچہ میری تجویز پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش بابو سمپورنانند کے دور حکومت میں اس کا نام 'نیا دور' رکھا گیا۔

عابد: آپ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری رہے ہیں آپ سیاست میں کس طرح داخل ہوئے؟

زیـــدی: ۱۹۳۵ء میں جب میں جبلی کالج لکھنؤ کا طالب علم تھا تو اردو کے استاد حامد اللہ افسر صاحب نے کالج میں انجمن ادب اردو کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی تھی جس کے وہ خود بانی وصدر تھے۔ مجھے اس انجمن کا سکریٹری چنا گیا۔ اسی زمانے میں یہ خیال آیا کہ طالب علموں کو منظّم کرنا چاہئے۔ چنانچہ پریم نرائن بھارگو اور ایم این بدرالدین وغیرہ نے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور آل انڈیا باڈی بنانے کی تجویز رکھی۔ باڈی بنانے کے لئے کیلاش ناتھ ورما جو آچاریہ نریندر دیو کے بھتیجے تھے انہوں نے میرے ساتھ کافی دوڑ دھوپ کی اور ۱۹۳۶ء میں گنگا پرشاد ہال امین آباد لکھنؤ میں پہلی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت محمد علی جناح نے اور افتتاح جواہر لال نہرو نے کیا۔ جناح اس وقت قوم پرور مانے جاتے تھے اور یہ آخری موقع تھا جب دونوں لیڈر ایک ساتھ تھے۔ نہرو جی تو افتتاح کر کے چلے گئے لیکن جناح نے دوروزہ اجلاس کی صدارت کی۔ کانفرنس کے بعد آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں مجھے اس کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔

عـــابد: آپ نے طالب علموں کی سیاست کی ہے اس زمانے اور آج کی سیاست میں آپ کچھ فرق محسوس کرتے ہیں؟

زیـــدی: جہاں تک آج کے طلبا کی سیاست کا تعلق ہے اس میں بہت بڑا فرق محسوس کر رہا ہوں اس لئے کہ ہمارے زمانے میں اختلافات ضرور رہتے تھے لیکن کامن ایشوز پر سب ایک رہتے تھے۔ اس لئے میں یہ کہوں گا کہ اس نازک دور میں طلبا جماعت بندی ترک کر کے ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہوں تاکہ اہم، پیچیدہ اور مشکل مسائل حل ہوں اور اپنی اپنی پارٹی کے تخیلات وتصورات سے اٹھ کر ملک اور

امن عالم کے تصور کو پیش نظر رکھ کر خاص طور سے اکیسویں صدی میں ملک کی ترقی اور اقتصادی وسماجی مسائل کو حل کرنے میں مددگار ہوں۔ آج حالت یہ ہے کہ طالب علموں کی تنظیمیں کسی نہ کسی پارٹی کا دم چھلا بن کر رہ گئی ہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ طلبا یونیورسٹی اور کالجوں میں کسی پارٹی کا دم چھلا بن کر نہ رہیں۔ جب وہ یونیورسٹی یا کالج سے باہر چلے جائیں تو کسی پارٹی سے وابستہ ہوں۔ پارٹیوں کو بھی چاہئے کہ طلبا کے ذیلی شعبے کو ختم کردیں تاکہ تعلیم یافتہ نوجوان آزادانہ طریقے سے سوچ سکے اور نوجوانوں کے مسائل حل کرنے میں اگر وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔

عـــابـد: آپ نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے کوئی دلچسپ بات بتائیں جن سے دوسروں کو سبق حاصل ہو؟

زیـــدی: زندگی کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ میں مولانا بننے جارہا تھا لیکن والد کے انتقال کے سبب نہیں بن سکا اور میرے چھوٹے دادا حاجی علی عباد نے مجھے انگریزی پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرا واقعہ میری شادی کا ہے جو کہ بچپن سے طے تھی لیکن میری گرفتاری کے سبب یہ رشتہ ختم ہوگیا۔ اسی واقعہ سے متاثر ہوکر میں نے جیل میں ایک نظم 'تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی' لکھی تھی۔ تیسرا واقعہ جو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ جب ناگپور میں مجھے گرفتار کر کے جیل لے جایا جارہا تھا اور اس وقت ایک پان والا میرے پاس آیا اور میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر مبارک باد دیتے ہوئے پان کھلایا۔ انسپکٹر نے یہ دیکھ کر اس پان والے کو تھپڑ مار دیا جس کی مجھے بہت تکلیف ہوئی اور آج بھی تصورات میں اس تھپڑ کی تکلیف محسوس کرتا ہوں۔

عابد: آپ نے زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا؟

زیـــــدی: پایا سب کچھ اور کھویا بھی بہت کچھ۔ مولانا ہونا تھا نہ ہو پایا۔ سیاست میں سرگرم حصہ نہ لیتا تو سول سروس میں ہوتا لیکن اس کا مجھے افسوس نہیں ہے۔ میں نے بہت شان سے زندگی گزاری اور جس شعبہ سے منسلک رہا عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور خاص طور سے میری عزت مجاہد آزادی کی وجہ سے بہت تھی یہی وجہ تھی کہ میرے افسران اور وزراء تک میرا احترام کرتے تھے۔ ساری دنیا کا لگ بھگ سفر کیا ہے۔ دنیا کے بیشتر بڑے ادیبوں شاعروں اور عالموں سے ملاقات کی ہے۔ نیک اور سعادت منداولادیں بھی ہیں جس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

عـــابـد: آپ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں اب مشاعرے میں کیوں نہیں شریک ہوتے؟

زیـــــدی: طالب علمی کے زمانے سے کشمیر کی ملازمت تک مشاعرہ میں شریک ہوتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے مشاعروں میں بھی شرکت رہتی تھی لیکن بعد میں چھوڑ دیا۔ اب میں شاعری صرف تفریح طبع کے لئے کرتا ہوں اس لئے کہ اب میں تحقیقی اور تنقیدی کاموں پر اپنا زیادہ وقت صرف کرتا ہوں۔

عابد: آپ کو صحافت سے کیسے دلچسپی ہوئی؟

زیدی: میں نے پہلا مکان چودھری گڑھیا لکھنؤ پر لیا تھا۔ اسی کی پشت پر 'حقیقت' کا دفتر تھا۔ میرے عزیز سید اعظم حسین صاحب (ایڈیٹر سرفراز لکھنؤ) سے غلام احمد فرقتؔ مرحوم سے دوستی تھی اور ان کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔ اسی زمانے میں انیس عباسی مرحوم نے 'نیو کریسینٹ' نام سے انگریزی اخبار نکالا جس میں لکھنے کے لئے کہا۔ ساتھ ہی ساتھ 'صداقت' میں فرقتؔ صاحب نے نوجوان شعرا و ادبا کے

بارے میں لکھنے کے لئے کہا ۔ اس طرح صحافت سے وابستہ ہوگیا ۔ جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا تو 'زمانہ' کانپور جیسے اہم رسالے میں میری غزل چھپی ۔ ۱۹۳۶ء میں 'نیرنگ خیال' لاہور میں 'مشاعرے کی تاریخی اہمیت' پر اور 'زمانہ' کانپور کے 'پریم چند نمبر' میں میرا پچیس یا چھبیس صفحے کا مضمون شائع ہوا اور جب سے اب تک مسلسل لکھ رہا ہوں ۔

عابد: اپنے ہم وطنوں کیلئے کوئی پیغام؟

زیـــــدی: اپنے ہم وطنوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہوں ۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کی تعلیم پر دھیان دلانا چاہتا ہوں ۔ خصوصیت سے مسلمانوں کو اس لئے کہ ہم مسلمانوں کا بیشتر علمی و ادبی سرمایہ اردو و فارسی میں ہے ۔ اگر اس زبان سے ہماری نئی نسل نابلد رہ گئی تو ہمارا علمی سرمایہ تلف ہو جانے کا خطرہ ہے ۔

کتابیات

(۱) انتخاب علی جواد زیدیؔ: علی جواد زیدیؔ: انجمن ترقی اردو دہلی: ۱۹۷۱ء

(۲) افکار و نظریات: ای۔اے۔حیدری: ناشر مصنف

(۳) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۴ء

(۴) انیس کے سلام: علی جواد زیدیؔ: ترقی اردو بیورو دہلی: ۱۹۸۱ء

(۵) اردو میں قومی شاعری کے سو سال: علی جواد زیدیؔ: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ: ۱۹۸۲ء

(۶) پیام آزادی: علی جواد زیدیؔ: محکمہ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ: ۱۹۴۷ء

(۷) تاریخ ادب کی تدوین: علی جواد زیدیؔ: نصرت پبلشر لکھنؤ: ۱۹۸۳ء

(۸) تیشۂ آواز: علی جواد زیدیؔ: مصنف: ۱۹۸۵ء

(۹) تعمیری ادب: علی جواد زیدیؔ: ادارۂ انیس الہ آباد: ۱۹۵۹ء

(۱۰) جدید اردو تنقید اصول و نظریات: ڈاکٹر شارب ردولوی: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ: ۱۹۸۱ء

(۱۱) دیار سحر: علی جواد زیدیؔ: حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی: ۱۹۶۰ء

(۱۲) دو ادبی اسکول: علی جواد زیدیؔ: نسیم بک ڈپو لکھنؤ: ۱۹۸۰ء

(۱۳) رباعیات انیسؔ: مرتبہ علی جواد زیدیؔ: ترقی اردو بیورو دہلی: ۱۹۸۵ء

(۱۴) رگ سنگ: علی جواد زیدیؔ: اشاعت گھر حیدر آباد: ۱۹۴۴ء

(۱۵) سلسلہ (انتخاب کلام زیدیؔ): ڈاکٹر خلیق انجم: انجمن ترقی اردو دہلی: ۱۹۹۰ء

(۱۶) ضبط شدہ نظمیں: ڈاکٹر خلیق انجم: انجمن ترقی اردو دہلی: ۱۹۷۵ء
(۱۷) قصیدہ نگاران اتر پردیش: علی جواد زیدیؔ: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ: ۱۹۸۳ء
(۱۸) مثنوی نگاری: علی جواد زیدیؔ: مصنف: ۱۹۸۵ء
(۱۹) ملک ادب کے شہزادے: ڈاکٹر سید اعجاز حسین: کارواں پبلشرز الہ آباد: ۱۹۵۴ء
(۲۰) میری غزلیں: علی جواد زیدیؔ: سرفراز قومی پریس لکھنؤ: ۱۹۵۹ء
(۲۱) نسیم دشت آرزو: علی جواد زیدیؔ: مصنف: ۱۹۸۲ء
(۲۲) نغمۂ آزادی: علی جواد زیدیؔ: محکمہ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ: ۱۹۵۷ء
(۲۳) ورق ورق زنجیر: علی جواد زیدیؔ: قلمی: مملوکہ بیگم شہناز زیدی

اخبارات و رسائل

(۱) ماہ نامہ نگار کراچی (اصناف شاعری نمبر، نظم کی دنیا) دسمبر ۱۹۶۷ء
(۲) نیا ادب لکھنؤ: فروری ۱۹۴۰ء
(۳) خبر نامہ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ: اگست ۱۹۸۰ء
(۴) ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ: جون ۱۹۸۶ء
(۵) ماہ نامہ صبح دہلی: ستمبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء
(۶) ماہ نامہ آج کل نئی دہلی: اکتوبر ۱۹۷۲ء
(۷) ماہ نامہ پرچم ہند دہلی: نومبر ۱۹۶۹ء
(۸) افکار کراچی: جنوری ۱۹۸۶ء
(۹) سالار بنگلور: مارچ ۱۹۵۶ء
(۱۰) پاسبان چنڈی گڑھ: مئی ۱۹۶۷ء
(۱۱) ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ کے مختلف شمارے